ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیر مسئول:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۱۱

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی ایچ ڈی - ڈی لٹ (مرحوم)

صفر المظفر ۱۴۰۴ھ

مطابق

نومبر ۱۹۸۳ء

جلد دوم ، شمارہ ۹

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ابصار احمد

(ایم اے - ایم فل - پی - ایچ ڈی)

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

(ایم اے فلسفہ)

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

مطبع : آفتاب عالم پریس، لاہور

سالانہ : ۲۰/- روپے

اس شمارے کی قیمت : ۲/- روپے

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۲

ڈاکٹر ابصار احمد

الٓمّٓ (سورۂ دخان) ——— ۴

ڈاکٹر اسرار احمد

مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام ۹

مولانا محمد طاسین

علامہ اقبال سے ایک گفتگو ——— ۲۱

احمد افضال

صدرِ اسلام میں معاشی نظام ——— ۳۳

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

خریدار حضرات خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

صفر المظفر ۱۴۰۴ھ کا شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے — قارئین کی یاد دہانی کے لئے عرض ہے کہ 'حکمتِ قرآن' اور 'میثاق' ہر دو ماہانہ رسالے چونکہ ایک ہی ادارے یعنی قرآن اکیڈمی کے تحت شائع ہوتے ہیں اس لئے انتظامی اُمور میں سہولت کے پیشِ نظر ہم نے یہ طے کر دیا تھا کہ میثاق ہر ماہ کی یکم تاریخ کو شائع ہوگا اور حکمتِ قرآن پندرہ تاریخ کو — یہی وجہ ہے کہ قارئین تک یہ رسالہ ہر ماہ کی بیس تاریخ کے آس پاس پہنچ جاتا ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا حد درجہ محققانہ اور فکر انگیز مضمون شامل ہے۔ اسلام کی معاشی تعلیمات کے بارے میں ہمارے ہاں عموماً دو انتہائی نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو اسلامی نظام سے قریب تر سمجھتا ہے تو دوسرا اشتراکی نظام کو عین اسلام قرار دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کی جزوی مشابہت تو ان ہر دو نظاموں کے ساتھ پائی جاتی ہے لیکن یہ کہنا کہ اسلام کا معاشی نظام ہو بہو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کی مانند ہے یا اُس کی کامل ہم آہنگی اشتراکی نظام کے ساتھ ہے، کسی طور درست نہیں۔ ڈاکٹر یوسف گورایہ نے کوشش کی ہے کہ معروضی طور پر یہ معلوم کیا جائے کہ صدرِ اسلام میں اسلام کا معاشی نظام کیا تھا! اس پہلو سے ان کی کاوش قابلِ تحسین ہے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام محاضراتِ قرآنی حسبِ پروگرام ۲۸ اکتوبر تا یکم نومبر جناح ہال (لاہور) میں منعقد ہوئے۔ محاضرات میں شرکت کیلئے ہندوستان سے جن علماءِ کرام کی آمد متوقع تھی اُن میں سے صرف دو حضرات، مولانا عبدالکریم پاریکھ اور مولانا اخلاق حسین قاسمی مہتمم جامعہ رحیمیہ، درگاہ شاہ

ولی اللہ محدّث دہلوی، تشریف لاسکے - ہماری جانب سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ محاضرات میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو مرکزی مقرر کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ دعوتِ قرآن کے موضوع پر چار لیکچر ارشاد فرمائیں گے - لیکن عین وقت پر کسی مجبوری کے باعث مولانا تشریف نہ لاسکے - ان کی کمی یقیناً شدّت سے محسوس کی گئی تاہم ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے ایک اور بزرگ مولانا عبدالکریم پاریکھ نے محاضرات کے پانچوں روز خطاب فرماکر کسی حد تک ان کی تلافی کردی - واقعہ یہ ہے کہ تذکیر بالقرآن کے پہلو سے قرآن کے مضامین کو آسان فہم اور مؤثر انداز میں مولانا نے بیان فرمایا یہ یقیناً انہی کا حصّہ ہے -

محاضراتِ قرآنی کا پروگرام اللہ کے فضل و کرم سے بہت بھرپور رہا پانچوں روز سامعین کی تعداد توقع سے زائد رہی - یہاں تک کہ ہال میں نشستیں کم پڑنے کے باعث دریاں بچھانی پڑیں - محاضرات کی ان نشستوں میں ویسے تو تمام مقالے بڑے اہم تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی معلم قرآن اکیڈمی کا مقالہ بعنوان "اسلام کا جماعتی نظام" حد درجہ وقیع اور فکر انگیز تھا - مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی نے اپنا حد درجہ علمی مقالہ بعنوان "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" پیش فرمایا - اس کے علاوہ آپ نے محاضرات کی آخری نشست کی صدارت بھی فرمائی - ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے ان محاضرات کی چار نشستوں سے خطاب فرمایا - اُن کا موضوع تھا "مسلمانوں کی دینی ذمہ داریاں" قرآنِ حکیم کی روشنی میں - !

ان محاضراتِ قرآنی کی مفصل رپورٹ ان شاء اللہ العزیز - حکمتِ قرآن کے آئندہ شمارے میں پیش کی جائے گی - ہم ان محاضرات میں پڑھے جانے والے مقالوں کو ان شاء اللہ جستہ جستہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں گے -

وما توفیقی الا باللہ

ابصار احمد

سلسلۂ تقاریر الٓمّٓ

سورہ دُخان

مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

امّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا

مِّنْ عِنْدِنَا ط اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ط

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ صدق اللہ العظیم

سلسلہ حوامیم میں سورۂ زخرف کے بعد سورہ دخان آتی ہے یہ سورۂ مبارکہ ۵۹ آیات اور تین رکوعوں پر مشتمل ہے اس میں بھی سورۂ زخرف کی مانند حروف مقطعات یعنی حٰمٓ کے بعد قرآن حکیم کی قسم کھائی گئی ہے:

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝

"قسم ہے اس کتاب کی جو روشن ہے اور واضح ہے۔ اس میں کہیں بھی ابہام نہیں ہے۔ کہیں کوئی گنجلک پن نہیں ہے۔" اس کے بعد ذکر ہو رہا ہے اس بات کا جس کا سورۂ زخرف میں اشارہ تھا کہ یہ قرآن اصل میں، لوح محفوظ یا جسے وہاں "امّ الکتاب" سے تعبیر کیا گیا اس میں مرقوم ہے یہاں اس کے نزول کا ذکر ہو رہا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝

"ہم نے اسکو نازل فرمایا ایک بڑی ہی بابرکت رات میں"

یہ وہی رات ہے جس کا ذکر آخری پارے میں سورہ قدر میں ہوا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَیْلَةُ الْقَدْرِ ۝ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

"ہم نے اس قرآن کو نازل فرمایا بڑی ہی قدر و قیمت والی رات میں اور تمہیں کیا معلوم وہ قدر و قیمت والی رات کونسی ہے؟ اور وہ کیا ہے اور اسکی عظمت اور قدر و قیمت کا کیا عالم ہے۔

لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝

وہ ایک رات ہزار مہینوں سے زیادہ افضل ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرلینی چاہیئے کہ اس سلسلہ سُور میں اس سے پہلے کئی بار لفظ تنزیل آچکا ہے اور آئندہ بھی دو سورتوں میں یہ لفظ پھر آنیوالا ہے۔ یہاں نَزَّلَ، یُنَزِّلُ سے باب افعال کا مصدر انزال استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ انزال کسی چیز کو دفعتاً نازل کردینا ہوتا ہے۔ یکبارگی اتار دینا ہے۔ جبکہ باب تفعیل کے خواص میں سے یہ ہے کہ کوئی کام درجہ بدرجہ کیا جائے۔ تدریج کے ساتھ کیا جائے۔ یہ تدریج خود باب تفعیل سے ہے۔ قرآن مجید کے نزول کے دو مرحلے ہیں۔ ایک مرحلہ اس کا لوح محفوظ یا ام الکتاب سے سمائے دنیا تک نزول کا۔

یہ نزول دفعتاً واحدہ ہوا ہے، یکبارگی ہوا ہے۔ یہ لیلۃ المبارکہ میں ہوا ہے جس کا ذکر سورہ دخان میں ہے۔ اور یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا ہے جس کا ذکر سورہ قدر میں ہے وہ رات کہ جو رمضان مبارک میں ہے جس کے بارے میں گمانِ غالب یہ ہے کہ وہ ستائیسویں شب ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں چوبیسویں شب کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ بہرحال یہ ہے اس کے نزول کا درجہ اوّل، جس میں یہ نزول دفعتاً ہوا لوح محفوظ سے سمائے دنیا تک۔ اس کے بعد اسکے نزول کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا

اور وُہ نزول ہے محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وَآلہٖ وسلّم پر - یہ نزول دفعتاً واحدہ نہیں ہوا - یکبارگی نہیں ہوا - یہ تو لگ بھگ بائیس سال کے عرصے پہ پھیلا ہوا عمل ہے - تدریجاً ہوا ہے - تھوڑا تھوڑا کر کے نزول ہوا ہے - اس کے لئے باب تفعیل کا مصدر آتا ہے - تنزیل - حضورؐ پر قرآن مجید کا نزول بطور تنزیل ہے اور لوح محفوظ سے سمائے دنیا تک اس کا نزول بطرز انزال ہے - چنانچہ یہاں لفظ آیا -

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ٥

اس سُورہ مبارک کی آیات ۳۷ اور ۳۸ میں قرآن مجید میں ایمان بالآخرہ یامعاد کے لئے جو استدلال بار بار آیا ہے اسے منفی اور مثبت دونوں پیراؤں میں لایا گیا - آیت نمبر ۳۷ کے الفاظ ہیں -

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ٥

ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے ان سب کو کھیل کود کے لئے تخلیق نہیں فرمایا - یہ ایک عمل عبث نہیں ہے - یہ بیکار اور بے مقصد تخلیق نہیں ہے - یہ کھیل کود نہیں ہے - جیسا کہ بعض مذاہب نے جو اس کائنات کی گتھی سلجھا نہ سکے تو چار و ناچار انہوں نے رام کی لیلا کہہ کر راہ فرار اختیار کر لی کہ یہ دنیا یہ کائنات بس ایسے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کھیل رہا ہے اور جیسے کسی کھلنڈرے بچے کے کسی عمل میں کوئی حکمت اور کسی غرض و غایت کا ہونا ضروری نہیں ہے ایسے ہی یہاں بھی کسی حکمت کی تلاش جو ہے وہ کار عبث ہو گی یہ ایک کھیل ہے - معاذ اللہ، قرآن اس کی نفی کرتا ہے -

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ

یہ منفی اسلوب ہے اس کے بعد مثبت انداز میں فرمایا آیت نمبر ۳۸ میں

وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ -

ہم نے ان کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ اور یہ تخلیق بالحق ہے۔
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
"لیکن لوگوں کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔ غور و فکر سے کام نہیں لیتی"
اب آپ ذرا غور کیجئے کہ اگر کوئی عمل بالحق ہے عبث نہیں ہے بیکار نہیں ہے، باطل نہیں ہے تو اس میں کسی حکمت کا ہونا ناگزیر ہے۔ انسانی زندگی کی حکمت کیا ہے۔ اور بالخصوص انسان میں خیر و شر کا جو امتیاز پایا جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کی جو اقدار ہیں، جن کو وہ پہچانتا ہے۔ اور اسکی ضرورت لاحق نہیں ہوتی کہ اسکو بتایا جائے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ انسان اپنی فطری استعداد کے تحت جانتا ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور وہ فطرت کو آپ جانتا ہے۔ وہ واقف ہے اس سے کہ جھوٹ بولنا بُرائی ہے۔ لیکن یہ کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ سچ بولنے سے اکثر و بیشتر نقصان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اور جھوٹ بول کر بسا اوقات فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص جائز و ناجائز حلال و حرام کی تمیز کو ملحوظ نہ رکھے تو ہو سکتا ہے یہاں عیش کرے۔ گلچھرے اڑائے اور اگر کوئی اپنے اوپر ان حدود و قیود کو ان قدغنوں کو عائد کر لے تو ہو سکتا ہے کہ دو وقت کی سوکھی روٹی کے لئے بھی محتاج ہو جائے۔ یا تو یہ مانا جائے کہ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے یا یہ رام کی لیلا ہے جس میں کوئی حکمت نہیں ہے ورنہ ماننا پڑے گا کہ ایک اور زندگی ضروری اور لازم ہے۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ ایک اور عالم ہو ایک اور زندگی ہو جس کا اصل حکمران قانون، اخلاقی قانون ہو، جہاں نیکیوں کا بدلہ نکلے اور وہ جزا کی صورت میں نکلے اور اچھے بدلے کی صورت میں سامنے آئے اور بھرپور طور پر نکلے اور بدقماشوں کو ان کے بُرے اعمال کی اور ان کے کرتوتوں کی بھرپور سزا ملے یہ عالم آخرہ ہے۔ قرآن مجید کا یہ استدلال اس سورہ مبارکہ میں بھی آیا ہے۔ ابتداء ہی میں نزولِ قرآن کی غایت بیان کر دی۔ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝

ہم نے اس قرآن کو اس لئے نازل کیا ہے کہ ہم لوگوں کو خبردار اور تنبیہ کر دیں اور سورت کے آخر میں فرمایا:

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝

(آیت ۵۸)

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے اس قرآن کو آسان کر دیا ہے آسان فہم بنا دیا ہے۔ آپؐ کی زبان میں۔ تاکہ آپ کی یہ قوم اس کو سمجھ سکے۔ یہ قریش اور جمیع اہل عرب اس سے نصیحت حاصل کر سکیں یاد دہانی حاصل کر سکیں۔ آخر میں فرمایا:

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝ (آیت ۵۹)

اب اگر یہ نہیں مان رہے ہیں تو آپ بھی انتظار کیجئے یہ بھی انتظار کریں۔ حکم خداوندی آئے گا فیصلہ چکا دیا جائے گا۔ معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ اسی پر سورۂ حٰمٓ السجدہ جسے عام طور پر سورہ سجدہ کہا جاتا ہے، وہ بھی تقریباً انہی الفاظ پر ختم ہوئی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ۝

"اے نبیؐ! ان کفار کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور آپؐ بھی انتظار کیجئے۔ یہ لوگ بھی انتظار میں ہیں" بہرحال وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ اصل حقیقت منکشف ہو جائیگی۔ جیسا کہ سورہ تکاثر میں فرمایا:

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظیم
ونفعنی وایاكم بالآیات والذكر الحكیم

مروّجہ نظام زمینداری اور اسلام

(قسط ۲)

از قلم : مولانا محمّد طاسین

امام ابوبکر الحازمی نے ناسخ و منسوخ احادیث پر اپنی کتاب میں جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ یہ کہ پہلے وہ ایک مسئلہ کے متعلق وہ احادیث بیان کرتے ہیں جو ان کے نزدیک منسوخ ہوں اور پھر وہ احادیث نقل کرتے ہیں جو ان کی دانست میں ناسخ ہیں یا پھر ایک ہی ایسی حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں ایک مسئلہ کے متعلق یہ تصریح ہوتی ہے کہ پہلے اس کی اجازت تھی بعد میں ممانعت وارد ہوئی، مزارعت کے متعلق بھی انہوں نے ایسا ہی کیا ہے، پہلے وہ احادیث ذکر کی ہیں جن سے اس معاملہ کی اجازت اور اباحت اخذ کی جاسکتی ہے پھر وہ حدیث نقل فرمائی ہے جس میں یہ صراحت ہے کہ اس معاملے کی نہی اور ممانعت اس کی اجازت کے بعد وجود میں آئی، عنوان کے الفاظ یہ ہیں "ذکر خبر یصرّح بالاذن والنھی بعدہٗ" ذکر اس حدیث کا جس میں یہ تصریح ہے کہ مزارعت کی اجازت پہلے اور نہی بعد میں ہوئی، اور پھر اس عنوان کے تحت جو حدیث ذکر فرمائی وہ حسب ذیل ہے:

اخبرنا الفضل بن القاسم الصیدلانی، انا الحسن بن احمد، انا احمد بن عبد اللہ، انا ابواسحاق المزکی، انا مکی بن عبدان، ثنا جریر عن عبد العزیز وھو ابن رفیع :

عن رفاعۃ بن رافعؓ بن خدیج	حضرت رفاعہ بن رافع بن خدیج سے
ان رجلا کانت لہ ارض فعجز	روایت ہے کہ (عہد رسالت میں) ایک
عنھا ان یزرعھا فجاءہ رجل	شخص کی زمین تھی جسے وہ کاشت کرنے
فقال لہ ھل لک ان ازرع ارضک	سے عاجز رہا، اس کے پاس ایک دوسرا

فما خرج منها من شيئ كان بيني وبينك فقال نعم حتى اسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله فلم يرجع اليه شيئا قال فاتيت ابا بكرؓ وعمرؓ فقلت لهما، فقالا ارجع اليه فرجعت اليه الثانية فسألته فلم يرد علیّ شيئا، فرجعت اليهما فقالا انطلق فازرعها فانه لو كان حراما نهاك عنه قال فزرعها الرجل حتى اهتز زرعه واخضر و كانت الارض على طريق لرسول الله صلى الله عليه وسلم فمر بها يوما فابصر الزرع فقال لمن هذه الارض؟ فقالوا لفلان زارع بها فلانا، فقالؐ ادعوهما الیّ جميعا قال فاتيناه فقال لصاحب الارض ما انفق هذا فی ارضك فرده عليه ولك ما اخرجت ارضك .

(ص ١٧٦، كتاب الاعتبار)

شخص آیا اور اس نے کہا کہ کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کی زمین کاشت کروں اور جو پیدا ہو وہ میرے اور آپ کے درمیان تقسیم ہو اس نے جواب دیا ہاں یہ ہو سکتا ہے جبکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں۔ چنانچہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا تو آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا پھر وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس آیا اور ان سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا پھر حضورؐ کے پاس جاؤ اور دوبارہ پوچھو۔ چنانچہ وہ پہنچا اور دریافت کیا تو آپؐ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پھر حضرت صدیقؓ وفاروقؓ کے پاس لوٹا۔ انہوں نے اس کی بات سن کر فرمایا جاؤ اور زمین مزارعت پر دے دو کیونکہ اگر یہ معاملہ حرام ہوتا تو حضورؐ ضرور منع فرماتے، دوسرے شخص نے مزارعت پر اس زمین کو کاشت کیا۔ یہاں تک کہ کھیتی لہلہائی اور سرسبز ہوئی اور یہ زمین اس راستے پر واقع تھی جس سے کبھی رسول اللہؐ گزرتے تھے چنانچہ ایک دن رسول اللہؐ وہاں سے گزرے اور کھیتی دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کس کی زمین ہے لوگوں نے بتلایا فلاں شخص کی ہے اور اس نے مزارعت پر فلاں کو دی ہے، آپؐ نے فرمایا دونوں کو میرے پاس بلاؤ، جب دونوں آئے تو آپؐ نے زمین والے سے فرمایا اس کاشتکار نے تیری زمین میں جو خرچہ کیا ہے اس کو دے دو اور زمین

سے جو پیدا ہو وہ تمہارا ہے، اس طرح اس معاملے کو ختم کر دینے کا حکم دیا

بہرحال اس حدیث کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا جس میں مزارعت کے جواز و عدم جواز کے متعلق کوئی شرعی حکم موجود نہ تھا۔ ایک موقع پر باوجود پوچھنے کے آپؐ نے کوئی جواب نہ دیا اور سکوت فرمایا، پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپؐ نے اس معاملے کو فسخ کرنے کا حکم دیا اور اس سے قطعی طور پر نہائت واضح الفاظ میں منع فرمایا، لہٰذا اس سے امام ابوبکر الحازمی کا یہ مطلب لینا کہ نہی مزارعت کی حیثیت ناسخ کی ہے بالکل صحیح ہے اور پھر یہ ایک ایسے محدّث کی رائے ہے جو فقہ و فہم حدیث میں ممتاز درجہ کے مالک ہیں۔

ترجیح کے طریقہ سے احادیث مزارعت کا جائزہ!

نسخ کے طریقہ سے احادیث مزارعت کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم ترجیح کے طریقہ سے ان کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس طریقہ سے کونسی احادیث راجح اور کونسی مرجوح قرار پاتی ہیں۔

علماء اصول الحدیث اور فقہاء اصول الفقہ نے متعارض احادیث میں سے بعض کے بعض پر ترجیح کے جو قاعدے لکھے ہیں ان میں سے چند نمایاں قاعدے یہ ہیں :—

۱ - جب دو متعارض حدیثوں میں سے ایک قولی ہو اور دوسری فعلی تو قولی کو فعلی پر ترجیح ہوگی۔

۲ - جب دو متعارض احادیث میں سے ایک کسی چیز کی حرمت پر دلالت کرتی ہو اور دوسری اس چیز کی اباحت پر، تو حرمت والی حدیث کو اباحت والی حدیث پر ترجیح ہوگی۔

۳ - جب دو متعارض حدیثوں میں سے ایک کے اندر عام اور کلّی حکم اور دوسری کے اندر خاص اور جزوی حکم ہو تو عام اور کلّی حکم والی حدیث کو

خاص اور جزوی حکم والی حدیث پر ترجیح ہوگی۔

۴۔ جب دو متعارض احادیث میں سے ایک اپنے مطلب کے لحاظ سے واضح و مفصّل اور دوسری اپنے مطلب کے لحاظ سے مبہم و مجمل ہو تو اول الذکر کو ثانی الذکر پر ترجیح ہوتی ہے۔

۵۔ جب دو متعارض حدیثوں میں سے ایک کسی خاص واقعہ سے متعلق اور مقیّد ہو اور دوسری مطلق اور مجرّد ہو تو پہلی پر دوسری کو ترجیح ہوگی۔

۶۔ دو متعارض احادیث میں سے جس حدیث کی تائید دوسری احادیث سے ہوتی ہو اسے دوسری حدیث پر ترجیح ہوگی جس کی مؤیّد کوئی اور حدیث نہ ہو۔

۷۔ دو متعارض حدیثوں میں سے جس حدیث کے راوی متعدّد صحابۂ کرامؓ یا متعدد تابعینؒ ہوں اسے اس حدیث پر ترجیح ہوتی ہے جس کا راوی صرف ایک صحابی یا ایک تابعی ہو۔

۸۔ دو متعارض احادیث میں سے جس حدیث کا راوی خود وہ شخص ہو جس سے اس حدیث کے مضمون کا براہِ راست تعلق ہے اسے اس دوسری حدیث پر ترجیح ہوتی ہے جس کا راوی ایسا شخص ہو جس سے اس حدیث کا براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو۔

۹۔ جب دو متعارض حدیثوں میں سے ایک کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نصًا اور صراحۃً ہو اور دوسری کی نسبت قیاسًا اور اجتہادًا ہو تو پہلی حدیث کو دوسری پر ترجیح ہوگی۔

۱۰۔ دو متعارض احادیث میں سے جب ایک کے مرفوع ہونے پر اتفاق ہو اور دوسری کے مرفوع ہونے میں اختلاف ہو تو جس کے مرفوع ہونے پر اتفاق ہے اسے اس حدیث پر ترجیح ہوگی جس کے مرفوع و موقوف ہونے میں اختلاف ہے۔

۱۱۔ جب دو متعارض حدیثوں میں سے ایک قرآن مجید کے ظاہری مطلب سے مطابقت رکھتی اور دوسری مطابقت نہ رکھتی ہو تو قرآن سے مطابقت رکھنے والی حدیث کو قرآن مجید سے مطابقت نہ رکھنے والی حدیث پر

ترجیح ہوگی۔

۱۲۔ دو متعارض احادیث میں سے جو حدیث عقل وقیاس کے مطابق ہو اُسے اس حدیث پر ترجیح ہوتی ہے جو عقل وقیاس کے مخالف ہو۔

۱۳۔ جب دو متعارض حدیثوں میں ایک حدیث کے راوی کا فتویٰ اور عمل اس کے مطابق ہو اور دوسری کے راوی کا فتویٰ اور عمل اس کے خلاف ہو تو اوّل الذکر کو ثانی الذکر پر ترجیح ہوتی ہے۔

۱۴۔ متعارض احادیث میں سے جو مطوّل و مفصل ہو اسے اس حدیث پر ترجیح ہوگی جو مختصر و مجمل ہو۔

۱۵۔ جب دو متعارض احادیث میں سے ایک کے اندر حکم لفظی طور پر مذکور اور منطوق ہو اور دوسری کے اندر معنوی طور پر مفہوم اور متحمل ہو تو پہلی قسم کی حدیث کو دوسری قسم کی حدیث پر ترجیح ہوتی ہے۔

متعارض احادیث میں سے ایک کے دوسری پر ترجیح کے یہ جو پندرہ قاعدے اور ضابطے بیان کئے گئے ہیں یہ عام و مشہور اور ہماری زیر بحث احادیث سے قریبی تعلق رکھتے ہیں ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ علامہ ابوبکر الحازمی نے وجوہ ترجیح کی تعداد پچاس تک لکھی ہے اور علامہ السیوطی نے تدریب الراوی میں ایک سو تک اور علامہ العراقی نے التقیید والایضاح شرح مقدمہ ابن صلاح میں ایک سو دس ذکر کی ہیں جنکی تفصیل مذکورہ کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مذکورہ پندرہ قاعدوں اور ضابطوں کی روشنی میں احادیث مزارعت کا گہرا اور تحقیقی جائزہ لیا جائے تو وہ احادیث جو مزارعت کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں صاف طور پر راجح اور جو جواز پر دلالت کرتی ہیں مرجوح نظر آتی ہیں۔ اس کی کچھ تفصیل یہ کہ جو حضرات جواز مزارعت کے دعویدار ہیں وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں بالخصوص دو احادیث پیش کرتے ہیں: ایک حدیث خیبر جس پر قبل ازیں خاصی بحث ہو چکی ہے اور دوسری حضرت طاؤس کی روایت کردہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی وہ حدیث جس سے مزارعت کا غیر ادلی اور

غیر اخلاقی معاملہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جس پر پہلے کچھ بحث کی گئی ہے، اور جو حضرات مزارعت کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ حضرت جابرؓ، حضرت ابوھریرہؓ حضرت ابوسعید الخدریؓ، حضرت ظہیر بن رافع، حضرت رافع بن خدیج، حضرت عائشہؓ صدیقہ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ثابتؓ بن الضحاک، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی مذکورہ سابق احادیث سے استدلال کرتے ہیں، ان حضرات کی احادیث جن وجوہ کی بنا پر حدیثِ خیبر پر ترجیح رکھتی اور راجح قرار پاتی ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ کہ حدیثِ خیبر فعلی حدیث ہے اور یہ قولی احادیث ہیں، دوسری وجہ یہ کہ حدیث خیبر مزارعت کی اباحت پر دلالت کرتی ہے اور یہ احادیث اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، تیسری وجہ یہ کہ حدیثِ خیبر ایک مخصوص جزوی واقعہ سے تعلق رکھتی اور ایک محدود اور مقید حکم پر دلالت کرتی ہے جبکہ یہ دوسری احادیث اپنے اندر عموم کے ساتھ ایک کلی قانون رکھتی ہیں، چوتھی وجہ یہ کہ حدیثِ خیبر میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ یقینی طور پر مزارعت نہیں بلکہ اس کے متعلق جہاں یہ احتمال ہے کہ وہ مزارعت ہو وہاں یہ احتمال بھی ہے کہ مزارعت نہ ہو بلکہ خراج مقاسمت کا معاملہ ہو جبکہ ان دوسری احادیث میں جو نہی مزارعت پر دلالت کرتی ہیں۔ مزارعت کی تصریح ہے۔ پانچویں وجہ یہ کہ حدیث خیبر اپنے اصل کے لحاظ سے ایک ہی حدیث ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسری احادیث اپنے اصل کے اعتبار سے متعدد احادیث ہیں۔ چھٹی وجہ یہ کہ حدیث خیبر کی کسی دوسری مرفوع حدیث سے تائید نہیں ہوتی جبکہ اس کے بالمقابل ہر حدیث کی دوسری احادیث سے تائید ہوتی ہے، ساتویں وجہ یہ کہ حدیثِ خیبر قرآن مجید کے اس اصولی تصور سے مطابقت نہیں رکھتی جو معاشی معاملات کے جواز و عدم جواز سے متعلق اس میں پایا جاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل احادیث، قرآن مجید کے اصولی تصور سے مطابقت رکھتی ہیں، آٹھویں وجہ یہ کہ حدیثِ خیبر کے راویوں جیسے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کا فتوی اور عمل حدیث خیبر کے خلاف تھا یعنی وہ مزارعت کو ناجائز سمجھتے اور کہتے تھے۔

جبکہ اس کے بالمقابل دوسری احادیث کے راویوں کا فتویٰ اور عمل ان کے مطابق تھا۔ جیسے حضرت جابرؓ، حضرت رافع بن خدیج، ظہیر بن رافعؓ اور اسید بن ظہیر وغیرہ۔ نویں وجہ یہ کہ حدیث خیبر میں جس معاملے کا ذکر ہے اگر بالفرض اسے مزارعت کا معاملہ مان لیا جائے تو غیر مسلم ذمیوں کی حد تک تو اس کا جواز حتمی ہوگا لیکن مسلمانوں کی حد تک حتمی نہ ہوگا کیونکہ اس میں کوئی ایسے الفاظ موجود نہیں جو مسلمانوں کے درمیان اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، جبکہ نہی مزارعت والی احادیث میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو پوری صراحت کے ساتھ مسلمانوں کے مابین اس معاملہ کے عدم جواز پر دلالت کرتے ہیں، دسویں وجہ یہ کہ حدیث خیبر میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ یہود کی حد تک بھی یہ معاملہ عارضی اور خاص حالات کے ساتھ مشروط مقید تھا یعنی مستقل اور مطلق نہ تھا جس کا مطلب یہ کہ اس حدیث مزارعت کا جو جواز مستنبط ہوتا ہے وہ عارضی اور مقید ہے جبکہ نہی مزارعت والی احادیث سے جو عدم جواز ثابت ہوتا ہے وہ مستقل اور مطلق ہے۔

میں صرف ان دس وجوہ کے بیان پر اکتفاء کرتا ہوں ورنہ اور بھی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر حدیث خیبر کے بالمقابل نہی مزارعت والی احادیث کو ترجیح حاصل ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

اس کے بعد اب اس دوسری حدیث کو لیجئے جو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب اور جس کے واحد راوی حضرت طاؤس بن کیسان ہیں اور جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گو کراہیت کے ساتھ سہی لیکن مزارعت جائز ہے بالفاظ دیگر اگرچہ اخلاقاً نہ سہی لیکن قانوناً جائز ہے۔ ترجیح کے طریقہ سے جب اس حدیث کا نہی مزارعت والی احادیث سے موازنہ کیا جائے تو کئی وجوہ سے یہ حدیث مرجوح اور عدم جواز والی احادیث راجح نظر آتی ہیں: مثلاً پہلی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جو بات فرمائی ہے یعنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو نہ حرام کہا اور نہ اس سے روکا ہے بلکہ بطور ترغیب صرف یہ فرمایا ہے کہ تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ تم اپنی

زمین دوسرے کو کاشت کے لئے بلا معاوضہ دے دو۔ یہ بات دراصل ان الفاظ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں بلکہ ابن عباس کی بات ہے۔ جو انہوں نے کسی حدیث سے بذریعہ اجتہاد و استنباط سمجھی اور پھر اپنے الفاظ میں بیان فرمائی۔ لہٰذا اس حدیث سے مزارعت کا جو جواز نکلتا ہے اسے قطعیت کے ساتھ ابن عباس کی طرف تو منسوب کیا جا سکتا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا اور اس حدیث کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو جائز فرمایا ہے جبکہ اس کے بالمقابل مزارعت کے عدم جواز والی جو احادیث ہیں ان میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے الفاظ مذکور ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو ناجائز فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ حضرت ابن عباس کی یہ حدیث مزارعت کی اباحت پر دلالت کرتی ہے جبکہ اس کے بالمقابل دوسری احادیث اس کی تحریم پر دلالت کرتی ہیں تیسری وجہ یہ کہ اس حدیث کے راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ابن عباس ہیں اور عدم جواز والی احادیث کے راوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحابہ کرام ہیں۔ چوتھی وجہ یہ کہ ابن عباس سے اس حدیث کو روائت کرنے والے صرف ایک تابعی طاؤس بن کیسان ہیں۔ حالانکہ عدم جواز والی احادیث کو روائت کرنے والے تابعین کی بڑی جماعت ہے پانچویں وجہ یہ کہ حضرت ابن عباس کی اس حدیث کی تائید کسی دوسری حدیث سے نہیں ہوتی جبکہ عدم جواز والی ہر حدیث کی دوسری متعدد احادیث سے تائید ہوتی ہے۔ چھٹی وجہ یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کا تعلق زراعت پیشہ خاندان سے نہیں بلکہ تجارت پیشہ خاندان سے تھا لہٰذا معاملۂ مزارعت کا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا، جبکہ حضرت جابرؓ، حضرت ظہیرؓ، حضرت اسیدؓ، حضرت رافع بن خدیج وغیرہ کا انصار کے زراعت پیشہ خاندانوں سے تعلق تھا لہٰذا یہ معاملہ ان کے گھر کا معاملہ تھا۔ ساتویں وجہ یہ کہ اس حدیث کے راوی خود ابن عباسؓ کا فتویٰ اس کے خلاف تھا اور وہ مزارعت کو فاسد معاملہ کہتے اور اس سے روکتے تھے جیسا کہ پیچھے نقل کردہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ

اس کے بالمقابل احادیث کے راویوں کا فتویٰ اور عمل اپنی روائت کردہ احادیث کے خلاف ثابت نہیں۔ آٹھویں وجہ یہ کہ ابن عباسؓ کی یہ حدیث قرآنی تصورِ معاملات کے مطابق نہیں جبکہ عدم جواز والی احادیث اس کے مطابق ہیں۔ نویں وجہ یہ کہ ترجیح کے قاعدوں میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ متعارض حدیثوں میں سے جس کے اندر زجر و تہدید اور عذاب کی دھمکی ہو اسے بالمقابل حدیث پر ترجیح ہوتی ہے اور چونکہ مزارعت کے عدم جواز والی احادیث میں سے بعض کے اندر اس معاملہ کو نہ چھوڑنے والوں کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جنگ کی تہدید اور دھمکی ہے۔ لہٰذا اس حدیث ابنِ عباسؓ پر ان کو ترجیح حاصل ہے۔

اسی طرح دو متعارض حدیثوں میں سے جس حدیث کے الفاظ میں زیادہ اختلاف ہو اس پر اس دوسری حدیث کو ترجیح ہوتی ہے جس کے الفاظ میں اختلاف نہ ہو یا کم اختلاف ہو، اور چونکہ حضرت طاؤس کی روائت کردہ ابن عباسؓ کی زیرِ بحث حدیث میں بہت زیادہ اختلاف ہے، محدث ابوبکر الحازمی نے کتاب الاعتبار میں اس حدیث کے متعلق لکھا ہے:

هذا الحديث له طرق و	یہ حدیث ایسی ہے کہ اس کے بہت سے
فيه اختلاف الفاظ لا يمكن	طُرق ہیں اور اس میں الفاظ کا اتنا زیادہ
حصرها في هذا المختصر	اختلاف ہے جس کا احاطہ اس مختصر کتاب
(ص ۱۸۱)	میں ممکن نہیں۔

اس حدیث کے الفاظ میں جو اختلاف ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

(۱) قال طاؤس ان ابن عباس اخبرني	طاؤس نے کہا کہ ابن عباسؓ نے اس
ان النبي صلى الله عليه وسلم	کو بتلایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت
لم ينه عنها و قال لان يمنح	سے منع نہیں کیا اور فرمایا تم میں سے
احدكم اخاه خير له من ان	ایک کا اپنے بھائی کو اپنی زمین مفت دے
يأخذ عليها خراجا معلوما	دینا اس کے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس
(بخاری، ابن ماجہ، ابوداؤد)	کے کہ وہ اس کے بدلے کوئی متعین چیز

وصول کرے

(۲) عن طاؤس عن ابن عباس ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم لم یحرم المزارعۃ ولکن امر او اراد ان یرفق بعضھم ببعض
(ص ۲۳۸ ۔ جامع الترمذی)

طاؤس نے ابن عباسؓ سے روائت کیا کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مزارعت کو حرام نہیں ٹھہرایا بلکہ حکم دیا یا چاہا کہ ان میں سے بعض دوسرے بعض کے ساتھ نرمی و مہربانی سے پیش آئیں ۔

(۳) عن طاؤس عن ابن عباس ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم لم یحرم کراء الارض ولکنہ امر بمکارم الاخلاق

طاؤس سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کراء الارض کو حرام نہیں ٹھہرایا بلکہ آپؐ نے مکارم اخلاق کا حکم دیا ہے ۔

سنن النسائی کی ایک روائت کے الفاظ ہیں :

(۴) فابی طاؤس وقال سمعت ابن عباس لا یری بذلک بأسا

طاؤس نے ماننے سے انکار کیا اور کہا میں نے ابن عباسؓ سے سنا ہے وہ اس میں کچھ حرج محسوس نہیں کرتے تھے ۔

(۵) عن طاؤس عن ابن عباس انہ لما سمع اکثار الناس فی کراء الارض قال سبحان اللہ انما قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم الا منحہا احدکم اخاہ ولم ینہ عن کراءھا ۔
(ص ۱۷۹ ۔ سنن ابن ماجہ)

طاؤس نے ابن عباسؓ سے روائت کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جب سنا کہ لوگ زیادہ سختی کر رہے ہیں کراء الارض کے متعلق تو سبحان اللہ کہہ کر کہا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تو صرف یہ فرمایا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ تم میں سے ایک اپنی زمین اپنے بھائی کو یونہی دے دے اور آپؐ نے کراء الارض سے منع نہیں فرمایا ۔

(۶) عن طاؤس حدثنی اعلمھم بذلک یعنی ابن عباس ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم خرج الی

طاؤس نے کہا مجھ سے بیان کیا اس نے جو اس کا ان سب سے زیادہ علم رکھتا ہے یعنی ابن عباس نے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم

ارض تهتز زرعا فقال لمن هذه	ایک زمین کی طرف نکلے جو کھیتی سے لہلہا
فقالوا اکتراها فلان فقال اما	رہی تھی آپؐ نے پوچھا کس کی ہے۔ لوگوں
انه لو منحها ایاه کان خیرا له من	نے بتلایا کہ فلاں شخص نے اس کو کرائے
ان یاخذ علیها اجرا معلوما	پر دے رکھا ہے، اس پر آپؐ نے فرمایا اگر
(ص ۳۵۸ ۔ ج ۱ ۔ صحیح البخاری)	وہ اس کو بلا معاوضہ دے دیتا تو اس کے

کے لئے بہتر ہوتا بنسبت اس کے کہ اس کے بدلے مقررہ اجرت وکرایہ لیتا۔

ان روایات کے متون میں جو لفظی اختلاف ہے یہ حضرت طاؤس یا ان کے شاگرد کا پیدا کردہ ہے حضرت ابن عباسؓ سے ایک ہی حدیث جو انہوں نے سنی تھی اس کو مختلف اوقات میں انہوں نے مختلف الفاظ سے بیان کیا مقصد سب صورتوں میں ان کا ایک ہی رہا۔ وہ یہ کہ زمین والے کے لئے بہتر یہ ہے کہ اپنی زمین دوسرے کو کاشت کے لئے مفت بلا معاوضہ دے لیکن اگر کوئی مفت نہیں دیتا معاوضہ پر دیتا ہے تو یہ بھی حرام نہیں زیادہ سے زیادہ مکروہ ہی ہوسکتا ہے، بہرحال ایک ہی راوی کی ایک روائت کے الفاظ میں اتنا زیادہ اختلاف پایا جانا، روائت کی استنادی حیثیت کو کمزور کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ان احادیث کے مقابلہ میں مرجوح ہے جو نہیِ مزارعت سے متعلق متعدد صحابہ کرام سے مروی ہیں۔

پھر جہاں تک اس حدیث کے واحد راوی حضرت طاؤس بن کیسان کا تعلق ہے اس معاملے میں ان کا موقف عجیب سا ہے ایک طرف تو وہ حدیث ابن عباسؓ سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو اپنی زمین بغیر کسی خراج واجر کے مفت دیں کیونکہ یہ صورت اس کے مقابلہ میں ان کے لئے خیر وبہتر ہے کہ وہ اس کے بدلے کسی شکل میں کوئی معاوضہ وصول کریں خواہ وہ پیداوار زمین کے ایک حصّہ کی شکل میں ہو یا نقد دراہم ودنانیر کی شکل میں، دوسری طرف وہ سونے چاندی یعنی درہم ودینار کے بدلے کراء الارض کو حرام کہتے ہیں، مثلاً سنن النسائی میں ہے:۔

عن عمرو بن دینار قال کان طاؤس یکرہ ان یواجر ارضہ بالذھب والفضۃ ولا یری بأسا بالثلث والربع

حضرت عمرو بن دینار نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت طاؤس اس کو حرام سمجھتے تھے کہ زمین سونے چاندی کے عوض اجارہ پر دیں اور تہائی و چوتھائی پیداوار پر دینے میں کچھ حرج نہ دیکھتے تھے۔

جہاں تک ان کی روایت کردہ حدیث ابن عباسؓ کا تعلق ہے اس سے کراء الارض کی ہر شکل کا خواہ وہ پیداوار کے ایک حصہ کے بدلے ہو یا سونے چاندی یعنی دینار و درہم کے بدلے ایک ہی حکم معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ حرام نہیں غیر اولیٰ ہے، لیکن وہ حدیث کے برخلاف کراء الارض بالنقدین کو حرام فرماتے ہیں، اگر یہاں یہ کہا جائے کہ وہ کراء الارض بالنقدین کو حضرت جابر اور حضرت رافع بن خدیج وغیرہ کی احادیث کی بنا پر حرام سمجھتے تھے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان دوسرے صحابہ کرام کی احادیث ان کے نزدیک صحیح اور قابل اعتماد تھیں تو ان میں مزارعت و مخابرت کی بھی اسی طرح ممانعت تھی جس طرح دراہم و دنانیر کے بدلے کراء الارض کی ممانعت تھی تو پھر وہ ان احادیث کی بنا پر مزارعت کی حرمت کے کیوں قائل نہ ہوئے، کہیں ایسا تو نہیں جو ان کے ہمعصر اور ہم پایہ بعض تابعین کرام نے کہا ہے کہ چونکہ وہ خود مزارعت پر عمل پیرا تھے اور انہوں نے اپنی زمین مزارعت پر دے رکھی تھی۔ لہٰذا وہ اسے جائز کہتے تھے۔ حضرت طاؤس بن کیسان مزارعت پر عمل پیرا تھے اس کا ایک ثبوت صحیح البخاری کی اس حدیث سے فراہم ہوتا ہے جو اس طرح ہے۔

قرآن

چاہتا ہے کہ

واس پر ایمان لایا جائے — واسے پڑھا جائے

واسے سمجھا جائے — واس پر عمل کیا جائے۔

اور اسے دوسروں تک پہنچایا جائے

و آپ کا فرض ہے کہ آپ حسب استعداد ان حقوق کی ادائیگی کا بندوبست کیجیے۔

علّامہ اقبال سے ایک گفتگو

احمد افضال

سوال: آپ کے خیال میں شاعری کیا چیز ہے؟

جواب: دیکھیے! جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، ان میں سے ایک شعر بھی ہے[۱]۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور شاعر کا فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصّہ اسے دکھلایا گیا ہے، اس میں اوروں کو بھی شریک کرے[۲]

سوال: کون سا شعر کامیاب شعر قرار دیا جاسکتا ہے؟

جواب: جسے تم کامیاب شعر کہتے ہو وہ اور چیز ہے اور معیار پر پورا اترنے والا شعر اور چیز ہے۔ وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے پیغمبری کا جزو ہے۔ وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنّی معیار پر پوری اترتی ہو، 'کامیاب' شاعری ہے[۳]

سوال: آپ ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ کیا اس بات کو آپ پسند بھی کرتے ہیں؟

جواب: اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے بحیثیت ایک شاعر ہی کے جانتے ہیں، لیکن میں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں[۴]

سوال: آپ نے شاعری کو کیا سوچ کر اپنایا؟

جواب: میرا مقصد شاعری سے شاعری نہیں بلکہ یہ ہے کہ اوروں کے دلوں میں بھی

---

۱ اقبال نامہ جلد دوم، ص ۲۷۱

۲ مقالاتِ اقبال، ص ۱۸۸

۳ انوار اقبال، ص ۲۶

۴ اقبال نامہ، ج دوم، ص ۱۴۱

وہی خیالات موجزن ہو جائیں جو میرے دل میں ہیں[1]

سوال: آپ کی نظمیں اس قدر مقبول کیوں ہیں؟

جواب: میرے کلام کی مقبولیت محض فضلِ ایزدی ہے ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا[2]

سوال: آپ ایک فلسفی بھی ہیں۔ ذرا فلسفے کی تعریف کیجئے؟

جواب: فلسفہ نام ہے انسان کی دماغی کاوشوں کا۔ یہ کاوشیں آخر انسانی ہیں، ان میں یقین کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا[3]

سوال: اسلام کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟

جواب: اسلام جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں، دین ہے، مذہب نہیں ہے[4]۔ یہ ایک وحدت ہے جس میں فرد اور جماعت کو جزو کل کا سا تعلق ہے[5]۔ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے[6] اس میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے[7]

سوال: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے؟

جواب: وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر!

وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ

سوال: حضورِ اکرمؐ سے آپ کی عقیدت اور محبت مشہور ہے۔ اس کا سبب بتائیے؟

جواب: بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!!

سوال: کیا اسلام کا مستقبل روشن ہے؟

جواب: کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے

یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

---

[1] انوارِ اقبال صفحہ ۲۸۷ [2] اقبال کے حضور، ص ۶۲ [3] اقبال کے حضور، ص ۲۸۸

[4] اقبال نامہ ج اوّل، ص ۲۳۵ [5] " " ص ۷۶ [6] حرفِ اقبال، ص ۶۱

[7] اقبال کے حضور، ص ۲۶

سوال : کیا آپ اس کے آثار دیکھ رہے ہیں ؟

جواب: دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہیں، مگر یہ قومیں ابھی تک اپنی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں الجھی ہوئی ہیں۔ ان مشکلات کے خاتمے پر ذہنی انقلاب کا آغاز یقینی ہے۔ اور اس وقت تک امید ہے کہ ایسے آدمی پیدا ہو جائیں گے جو اس انقلاب کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے[1]

سوال : امتِ مسلمہ کی فلاح کس شے میں مضمر ہے ؟

جواب: گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جز بقرآن زیستن
بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو — ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

سوال : قرآنِ حکیم سے آپ کا گہرا لگاؤ بھی مشہور ہے۔ کیا آپ اپنے فلسفے کو قرآن ہی سے ماخوذ سمجھتے ہیں ؟

جواب: فکرِ من گردوں مسیر از فیضِ اوست — جوئے ساحل ناپذیر از فیضِ اوست

سوال : اتحادِ ملت کے متعلق آپ کا تصور کیا ہے ؟

جواب: ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر!!

سوال : کیا مسلمانوں کا باہمی اختلاف اور آپس کی لڑائیاں ہی ان کے زوال اور بربادی کا سبب نہیں ؟

جواب: یقیناً ! نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے[2] ہمارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے اتحاد مسلمان متحد ہو گئے تو ان کی جداگانہ قومیت تسلیم کر لی جائے گی تو ہم آزادی سے اپنا مستقبل تعمیر کر سکیں گے[3]

---

[1] اقبال نامہ ج ۲ ص ۳۴۸ [2] گفتارِ اقبال، ص ۱۸ [3] اقبال کے حضور، ص ۴۶

سوال: آپ نے اپنی نظم "وطنیت" میں وطن پرستی پر شدید تنقید فرمائی ہے۔ کیا آپ حُبّ الوطنی کے بھی خلاف ہیں؟

جواب: جی نہیں، آپ کو مغالطہ ہوا۔ وطن سے محبّت رکھنا اور اس کی عزّت کے لئے مرنا مسلمانوں کے لئے جزو ایمان ہے مگر وطنیت اس وقت اسلام سے ٹکراتی ہے جب یہ ایک سیاسی تصوّر کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور انسانی اجتماعیت کا اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔[1]

سوال: نظم "وطنیت" میں ملک و وطن کو آپ نے بُت سے تشبیہہ دی ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیے۔

جواب: وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے وطنی ترانے میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادّی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارا نہیں کر سکتا۔[2]

سوال: کانگریس کے وطنی قومیت کے نظریے سے مسلمانانِ ہند کو اختلاف کیوں ہوا؟

جواب: فی الحقیقت جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ ہے آدمی کا عقیدہ، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات۔ یہ چیزیں اس قابل ہیں کہ جن کی خاطر آدمی کا جینا مرنا ہو نہ کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ عارضی طور پر روحِ انسانی کا واسطہ ہو گیا ہو۔[3]

سوال: آپ نے ایک علیحدہ اسلامی ریاست کا نظریہ کس خیال کے تحت پیش فرمایا؟

جواب: میں نے صرف ہندوستان اور اسلام کے فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظّم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا ہے، اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوّت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و

---

[1] تقاریر و فرمودات اقبال، ص ۱۴۱ [2] شذرات فکر اقبال، ص ۸۳ [3] تقاریر و فرمودات اقبال، ص ۵۶

تمدّن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے، اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے[1]

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک الگ اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی؟

جواب: مجھے تو ایسا ہی نظر آتا ہے[2]

سوال: آپ کے خیال میں قیادت کا اسلامی معیار کیا ہے؟

جواب: نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

سوال: ہندوستان کے موجودہ حالات میں آپ کو کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے۔

جواب: جناح کے سوا کوئی شخص مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں[3]

سوال: کیا عام مسلمان بھی یہی خیال رکھتے ہیں؟

جواب: یقیناً، ہندوستانی مسلمان مسٹر جناح سے متوقع ہیں کہ اس پرآشوب دور میں ان کے مستقبل کے متعلق ان کی کامل اور واضح ترین رہنمائی کریں گے[4]

سوال: غلامی اور آزادی میں کیا فرق ہے؟

جواب: غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا!

سوال: ملّت کی تشکیل و استحکام کے لئے کیا چیز سب سے زیادہ ضروری ہے؟

جواب: یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے یہ وہ قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

---

[1] مضامینِ اقبال، ص ۱۲۱
[2] مضامینِ اقبال، ص ۱۱۹
[3] اقبال کے حضور ۲۹۸

سوال : کیا عصرِ حاضر میں ایمان خوش گوار نتائج پیدا کر سکتا ہے ؟

جواب : آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا   آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

سوال : کچھ لوگ آپ کو اشتراکی (سوشلسٹ) کہتے ہیں۔ کیا وہ سچے ہیں ؟

جواب : میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے ؎

سوال : کیا اسلام انسان کے معاشرتی اور اقتصادی حقوق کا تحفظ کرتا ہے ؟

جواب : اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے معاشرتی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے ؎ نیز ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے ؎

سوال : دورِ جدید کے انسان کی روحانی حالت کیا ہے ؟

جواب : روحانی اعتبار سے دنیا کی حالت کبھی ایسی پست نہیں تھی جیسی اب ہے، تاریخ سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض قوموں اور ملکوں پر اخلاقی موت طاری رہی، لیکن بحیثیت مجموعی آج کا انسان کہیں زیادہ گر گیا ہے ؎

سوال : لیکن ظاہراً تو وہ خوب ترقی کر رہا ہے ؟

جواب : ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

لہ اقبال نامہ جلد دوم، ص ۲۱۴
ےہ قائداعظم کے نام خط ۱۹۳۸ء
سہ اقبال نامہ جلد دوم، ص ۱۶
کہ اقبال کے حضور، ص ۱۲۰

سوال: آزادیٔ نسواں کے متعلق آپ کے خیالات کیا ہیں ؟
جواب: جس قوم نے عورت کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر ضرور پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے، تو اسے کسی دوسرے کام کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا، مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش بھی ہے۔[1]
سوال: گویا آپ پردے کے قائل ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت پردے میں رہ کر جائز سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہے اور اپنے فرائض ادا کر سکتی ہے؟
جواب: جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز کہ او با صد تجلی در حجاب است
سوال: آپ بے پردگی کو برائی کیوں خیال کرتے ہیں ؟
جواب: رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدر !
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر!
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر و دلیکن
جلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر
سوال: مسلمان خواتین کے لئے مثال اور نمونہ کس کا ہو سکتا ہے؟
جواب: مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ

---

[1] روزگارِ فقیر جلد اوّل

سوال: آپ مسلمان خاتون کو کیا نصیحت کریں گے ؟

جواب: اگر پندے زدرویشے پذیری ! ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر کہ در آغوش شبیرے بگیری

سوال: کیا آپ تعلیم نسواں کے خلاف ہیں ؟

جواب: نہیں۔ بلکہ جو حد اسلام نے مسلمان عورت کے لئے مقرر کر دی ہے' اس کے لحاظ سے اس کی تعلیم ہونی چاہیئے[1]

سوال: اس بات کی ذرا وضاحت فرمائیے ؟

جواب: قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر خانہ داری اور علم اصول حفظ صحت پڑھایا جائے[2] ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے نصاب سے خارج کر دیئے جائیں[3]

سوال: آپ کا مسلک کیا ہے ؟

جواب: اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے[4]

سوال: میرا مطلب تھا فقہی معاملات میں آپ کا مسلک کیا ہے ؟

جواب: میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے میں غیر مقلد ہوں اور عملی اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں[5]

سوال: یعنی آپ کا مسلک شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا سا ہے ؟

جواب: یہی سمجھ لیجئے۔ شاہ ولی اللہؒ کو تو میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کا نقیب سمجھتا ہوں[6]

---

[1] خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء، لاہور [2] مقالات اقبال صفحہ ۱۲۸
[3] شذرات فکر اقبال، ص ۸۵ [4] سید سلیمان ندویؒ کے نام خط ۱۹۳۲ء بحوالہ "سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر" ص ۱۸۴ [5] سیارہ ڈائجسٹ نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۴۰ [6] اقبال کے حضور، ص ۲۰۳

سوال: سیاست اور مذہب میں کیا رشتہ ہے ؟

جواب: سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں ہوتی ہے[1]۔ اور میرا یہ مصرع تو آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سوال: کیا مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں ؟

جواب: مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں ہے۔ کیونکہ سائنس یعنی علومِ جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں[2]۔ مذہب اور سائنس دونوں کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے، گو ان کے منہاجات ایک دوسرے سے مختلف ہیں، دونوں کی آرزو ہے کہ حقیقت کی تہہ تک پہنچیں[3]۔

سوال: آپ نے اپنی نظموں میں مسلم نوجوان کو شاہین سے تشبیہہ دی ہے کیوں؟

جواب: شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے — خلوت پسند ہے۔ تیز نگاہ ہے[4]۔

سوال: ذرا اس شعر کی تشریح کر دیجئے ؛

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

جواب: مطلب یہ کہ ہم لوگ غلطی سے اپنی انفرادی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ ہمارے ایمان کی کمزوری ہے۔ انسان تو پیدا ہی مرنے کے لئے ہوا ہے — صرف آج کل کا سوال ہے۔ لیکن قوم اور اس کی آئندہ نسل کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ وہ تو لارڈ ڈینی سن کے پہاڑی چشمے (Brook) کی طرح

---

[1] حرف اقبال، ص ۶۰ [2] گفتار اقبال، ص ۱۵۰ [3] تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ ص ۲۰۲ [4] اقبال نامہ جلد اوّل صفحات ۲۰۴، ۲۰۵

دائم رواں ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اگر اپنی حالت بہتر بنانا اور اپنا مستقبل سنوارنا ہے تو قومی اور ملی نقطۂ نظر سے سوچئے اور اس کے مطابق عمل کیجئے۔[1]

سوال: ایک سچے مسلمان کی کیا کیا خصوصیات ہیں؟

جواب: قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

سوال: مغربی تہذیب کے بارے میں کچھ اظہار خیال فرمائیے۔

جواب: نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

سوال: آج کل ہر چھوٹا بڑا مغربی اقدار اور مغربی تمدن کی نقل اتار رہا ہے۔ آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔

جواب: انسان جب کسی تہذیب سے متاثر ہوتا ہے تو اس کی اچھی بری سب باتیں اختیار کر لیتا ہے۔ مغربی تہذیب کی نقالی اور اس کے ظاہری اور سطحی پہلوؤں کی دل کشی بجائے خود ایک مصیبت تھی، مغربی تعلیم نے ہمارے لئے اور بھی فتنے پیدا کر دیئے۔[2]

سوال: ایسے لوگوں سے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

جواب: یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی — یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

سوال: دہریت اور الحاد کیوں کر پیدا ہوتا ہے؟

جواب: دہریت کی ایک نہیں کئی شکلیں ہیں، ایسے ہی اس کے الگ الگ اسباب بھی ہیں۔ ایک اہل سائنس کی دہریت ہے، ان کی نظر مادے اور اس کے شؤن سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایک اہل فلسفہ کی کہ اپنے فکر کی نارسائیوں میں گم ہیں، ایک عام دنیادار کی۔[3]

---

[1] روایت احمد الدین مارہروی، اردو ڈائجسٹ سالنامہ ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۲ [2] اقبال کے حضور، ص ۲۶
[3] ایضاً، ص ۶۷

سوال: خیر اور شر کا معیار کیا ہے ؟

جواب: جو چیز خودی کو قوی کرتی ہے وہ خیر ہے اور جو چیز اسے ضعیف کرتی ہے وہ شر ہے اور دین اخلاق اور فنون سب کا اسی معیار پر قائم ہونا ضروری ہے [1]

سوال: خودی سے یاد آیا ـــــ یہ فلسفۂ خودی ہے کیا چیز ؟ ہر شخص اس کی نئی تشریح کرتا ہے ۔

جواب: میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے ۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے [2]

گویا:ـــــــ

خودی کیا ہے ؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے ؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ مست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے !!
فلک جسطرح آنکھ کے تل میں ہے !!
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام !
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام !
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار ـــ!
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار !!

سوال: حصولِ مقصد کا راستہ آپ کی نظر میں کیا ہے ؟

جواب: بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

---

[1] دیباچہ اسرارِ خودی (انگریزی) [2] ایضاً

سوال: زندگی کی حقیقت کیا ہے ؟

جواب: زندگی وہ فرصت ہے جس میں خودی کو عمل کے بے انتہا مواقع میسّر آتے ہیں ۔ اور جس میں موت اس کا پہلا امتحان ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ اسے اپنے اعمال و افعال کی شیرازہ بندی میں کس حد تک کامیابی ہوئی [1]

سوال: کیا آپ دورِ جدید کے مسلمان کی صلاح و فلاح کے لئے اسے کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں ؟

جواب: قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں !
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

سوال: اب آخر میں یہ بتا دیجئے کہ قرآنِ حکیم کے حقوق مسلمانوں پر من حیث الامت کیا کیا عائد ہوتے ہیں ؟

جواب: اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم ــ تاکجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کن ــ نکتہ شرع مبیں را فاش کن

---

[1] تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۸۷

ڈاکٹر ابصار احمد ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی
کی تالیف (بزبان انگریزی، صفحات ۱۶۰)

کانٹ اور کرگیکارڈ

ایک تقابلی مطالعہ

شائع ہو چکی ہے

ناشر : مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

صدرِ اسلام میں معاشی نظام

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

روزی انسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کا آغاز ماں کے پیٹ سے ہوتا ہے اور انجام موت پر ہوتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے مسئلہ معاش کے حل کے لیے کوششیں جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے۔ ان کی تعلیمات میں مسئلہ معاش پر ہدایت موجود تھی۔ مختلف امصار و اعصار میں مفکرین و فلاسفہ نے اس مسئلہ پر اپنے افکار و نظریات پیش کیے ہیں جن کی بنیاد پر مختلف معاشی نظام معرضِ وجود میں آئے۔ اس طرح دینی تعلیمات اور مادی و الحادی تصورات اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے پیش ہوتے رہے اور مختلف معاشی نظام معرضِ وجود میں آتے رہے۔

حال ہی میں مادی تعلیمات و نظریات کی بنیاد پر ایک معاشی اور سیاسی نظام قائم ہوا ہے۔ جو اشتراکی نظامِ معیشت ہے۔ اس کے مقابلے میں سابقہ دینی اور لادینی معاشی نظاموں کے حامی اور علمبردار اپنے اپنے نظاموں کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ اور انہیں زیادہ بہتر اور مفید ثابت کرکے ان کے نفاذ کے لیے کوشاں ہیں — اسلام نے مسئلہ معاش پر جو تعلیمات دی ہیں۔ ان کی بنیاد پر تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں مختلف معاشی نظام قائم ہوتے رہے ہیں۔ ان تمام ادوار اور ان تمام نظاموں میں وہ نظام جو عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ میں قائم ہوئے سب مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر بہترین نظام ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان کا اجمالی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔

زر اور زمین دنیا میں قدیم ترین ذرائع روزگار ہیں۔ ان کی منصفانہ تقسیم پر معاشرت میں اعتدال و توازن پیدا ہوتا ہے اور ان میں بے انصافی سے ملک و

معاشرے میں ظلم و عدوان بڑھتا ہے۔ اسلام دنیا میں پہلا اور واحد نظامِ حیات ہے جس نے زر اور زمین کے معاملے میں عدل و احسان کو اپنایا اور ظلم و عدوان سے انسانیت کو نجات کی راہ دکھائی۔

عہدِ رسالت میں انفاق، صدقات، خیرات اور زکوٰۃ کے تحت ذرائع و وسائلِ معاش کی تقسیم کا نہایت منصفانہ نظام قائم ہوا۔ مسلمانوں میں سے صاحبِ ثروت لوگ اپنے غریب اور نادار بھائیوں کی مدد کے لیے خود بخود اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے تھے۔ اور اس کے عوض اللہ کی رضا کے سوا کچھ نہیں چاہتے تھے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ [1]

"اور ان لوگوں کی مثال جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی رضا چاہنے کے لیے"

مالدار اور آزاد مسلمان مفلوک الحال اور غلام مسلمانوں کی بہتری اور آزادی پر اپنی کمائی میں سے خرچ کر کے اسلامی معاشرت کو پروان چڑھاتے تھے۔

ہجرت کے بعد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی تعلیمات کو پوری آزادی کے ساتھ نظامِ حکومت کی شکل دینی شروع کی۔ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات و خیرات کے ساتھ ساتھ اسلامی نظامِ معاش کا نقشہ واضح طور پر اُبھر کر سامنے آنے لگا۔ زراعت، صنعت اور تجارت کے مروّجہ نظاموں میں جہاں جہاں اسلامی تعلیمات کے ساتھ تصادم پایا جاتا تھا، اسے ختم کیا جانے لگا اور اس کی جگہ ایک عادلانہ نظام قائم ہونا شروع ہوا۔ زائد از ضرورت دولت کی جمع احتکار اور کنز کو اللہ کی طرف سے عذابِ الیم (دردناک عذاب) قرار دیا گیا۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ [2]

جو لوگ جمع کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

---

[1] قرآن حکیم۔ سورہ ۲ : ۲۶۵ [2] قرآن حکیم (۹ : ۳۴)

مدینہ، مکہ اور حجاز کے باہر جب یمن، بحرین اور دوسرے عرب علاقے فتح ہوئے تو آنحضرت صلعم نے اسلام کا یہی عادلانہ نظام وہاں قائم کر دیا۔ جب پورا جزیرۂ عرب فتح ہو گیا تو آپؐ نے اسلامی معاشی نظام کو پورے عرب میں نافذ کر دیا۔ مشہور سیرت نگار ابن سید الناس نے اپنی کتاب "عیون الاثر"[1] میں اور عبدالحی الکتانی نے اپنی کتاب "نظام الحکومۃ النبویۃ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عاملین اور ان کے طرزِ حکومت کی تفصیلات درج کی ہیں۔ ان کے مطابق آنحضرتؐ کے عاملین نے جو معاشی نظام قائم کیا تھا اس کے تحت ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے صوبے اور علاقے میں سے ایک مقررہ مدّت کے اندر اندر غربت و افلاس ختم کر کے خوشحالی اور فارغ البالی پیدا کرنے کا ذمّے دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اس عظیم مقصد کو ایک مختصر مدّت میں حاصل کرنے کا طریقِ کار یہ تھا کہ وہاں کے امیر اور دولت مند طبقے سے دولت جمع کر کے غریب، مفلس اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یہ معاشی نظام قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق تھا۔

فرمانِ الٰہی ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ[2]

تاکہ دولت مالدار لوگوں میں ہی گردش نہ کرتی رہے۔

اور یہی سنتِ نبویؐ ہے:

تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ[3]

صدقات ان کے اغنیاء سے وصول کیے جائیں اور ان کے غرباء میں تقسیم کیے جائیں۔

تقسیم دولت کے اس نظام کا فوری طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ معاشرے سے دولت و غربت کا غیر مساوی نظام ختم ہو گیا اور اس کی جگہ منصفانہ اور عادلانہ نظام قائم ہو گیا۔ معاشرے میں دولت و امارت وجہِ عزّت و افتخار نہ رہی بلکہ اس کی جگہ تقویٰ اور صالحیت نے لے لی۔

---

[1] ابن سید الناس، عیون الاثر ۲ : ۲۴۶ [2] قرآن حکیم (۵۹ : ۷)

[3] حافظ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری ۳ : ۲۳۱۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ [1]

تم میں معزز ترین اللہ کے نزدیک متقی لوگ ہیں۔

لوگ اس لیے محنت نہ کرتے تھے کہ اس کے صلے میں وہ امیر اور دولت مند ہو جائیں گے بلکہ اس لیے محنت کرتے تھے کہ ان کی محنت کے عوض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بحیثیت مجموعی خوش حال ہو۔

وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ، لَا تَعْلَمُوْنَھُمْ اَللّٰہُ یَعْلَمُھُمْ [2]

ان کے مقابلے میں پوری قوت اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو۔ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو ڈراؤ گے اور اپنے دشمنوں کو بھی اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے۔

جنگوں میں مال غنیمت کا حصول محبوب ترین چیز تھی مگر اسلام میں اگر کوئی شخص جہاد کرے اور اس کی نیت متاعِ دنیا ہو تو اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

ابوداؤد میں ایک روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

رجل یرید الجھاد فی سبیل اللہ وھو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا۔

ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔

فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا اجر لہ [3]

آپؐ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔

ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

---

[1] قرآن حکیم ۴۹ : ۱۳ [2] قرآن حکیم ۸ : ۶۰

[3] ابوداؤد، جلد ۱ صفحہ ۳۴۲ (باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا)

کوئی شخص غنیمت کے لیے، کوئی نام کے لیے، کوئی اظہارِ شجاعت کے لیے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا۔؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قاتل لتکون کلمة الله هي العليا [1]

"جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔"

خدا کا بول بالا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے بعد اپنے تمام ذرائع و وسائل ایثار کرنے میں صَرف کر دے۔ اپنی ذہنی، جسمانی اور اعلیٰ صلاحیتیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دے۔ یہ ایثار اسے مزید محنت کرنے پر آمادہ کرے حتیٰ کہ وہ اس راہ میں اپنی جان تک قربان کر دے۔ یہ ہے وہ جذبہ محرکہ جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرتا ہے۔ محنت کے اس بے لوث جذبے نے اسلام کو تمام مادی نظاموں سے ممتاز کر دیا ہے۔ قرآن میں یہ مضمون دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے:۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ [2]

(ان سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ ظلم نابود ہو جائے اور صرف دین اللہ کے لیے باقی رہ جائے۔) دنیا میں سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ انسان کو اس کی خدا داد صلاحیتوں کے اظہار سے روک دیا جائے اور اسے بنیادی ضروریاتِ زندگی حاصل نہ ہوں جبکہ اللہ کا دین یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرے اور زائد از ضرورت مال انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر اللہ کی راہ میں وقف کر دے۔ عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دوران مسلمانوں میں ایثار و قربانی کا یہ جذبہ اس لیے پیدا ہو گیا تھا کہ مومنین نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کے بدلے جنت کا سودا کر رکھا تھا:

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری کتاب الجهاد، باب من قاتل لتکون کلمة الله هي العليا
صحیح مسلم کتاب الامارۃ

[2] قرآنِ حکیم ۲ : ۱۹۳

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ [1]

"بے شک اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنّت کے بدلے خرید لیے ہیں۔"

آج بھی مسلمان اگر ایمان کے اس معیار پر پورے اُتریں تو دنیا میں محنت کا یہی جذبہ محرکہ دوبارہ پیدا ہو سکتا ہے، جو سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں نظاموں کے لیے بہترین مثال ثابت ہو سکتا ہے۔ محنت کا یہ جذبہ محرکہ اور پیداواری قوت کا یہ داعیہ تاریخ معاشیات میں اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت چند سالوں میں غربت و افلاس ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کا معیار زندگی بلند ہو گیا اور معاشرے میں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ کو بنیادی اور محوری حیثیت حاصل ہے اس مبارک عہد کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس عہد میں جو نظام حکومت قائم ہوا وہ عہد نبوّت کی طرز پر چلا اور مستحکم ہوا۔ خلفائے راشدین نے تقسیم دولت کا جو نظام اپنایا وہ کتاب و سنّت کے عین مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فوری فیوض و برکات سے دنیا مستفید ہوئی۔ اسلامی نظام معاشیات پر لکھی جانے والی کتابوں میں امام ابو یوسفؒ کی "کتاب الخراج" اوّلین کتابوں میں سے ہے۔ اس لیے صحت و سند کے اعتبار سے اپنے موضوع پر نہایت مستند اور معتبر کتاب مانی جاتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے اپنی اس کتاب میں خلفائے راشدین کے نظام تقسیم دولت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر یحییٰ بن آدم کی "کتاب الخراج" اور امام ابو عبید بن سلام کی "کتاب الاموال" بھی بڑی جامع اور مبسوط کتابیں ہیں۔

امام ابو یوسفؒ نے ابن ابی نجیح کے حوالے سے روایت کی ہے کہ پہلے پہل جب اوّل خلیفہ راشد حضرت سیّدنا ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے پاس

---

[1] قرآن حکیم، ۹ : ۱۱۱

بحرین سے مال آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو کچھ دینے کا وعدہ فرما رکھا تھا آپؐ نے انہیں ادا کرنے کے بعد بقیہ تمام مال و دولت کو لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم میں آپؐ نے چھوٹے اور بڑے، آزاد اور غلام، مرد اور عورت سب کو برابر برابر حصہ دیا۔ اس تقسیم میں سب لوگوں کو سات درہم اور ایک تہائی حصہ آیا:

وبقیت بقیۃ من المال فقسمھا بین الناس بالسویۃ علی الصغیر والکبیر، والحر والمملوک، والذکر والانثی فخرج علی سبعۃ دراھم وثلث لکل انسان [1]

اگلے سال اس سے بھی زیادہ مال آیا۔ آپ نے تقسیم دولت کے اسی نظام کے تحت سب لوگوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ اس دفعہ ہر انسان کو بیس بیس درہم حاصل ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب دو سال تک تقسیم دولت کی اس پالیسی پر عمل کر چکے تو مسلمانوں میں سے بعض آپ کے پاس آئے اور کہا:

"یا خلیفۃ رسول اللہ انک قسمت ھذا المال فسویت بین الناس ومن الناس اناس۔ لھم فضل وسوابق وقدم، فلو فضلت اھل السوابق والقدم والفضل بفضلھم" [2]

"اے خلیفہ رسول اللہ، آپ نے یہ مال تقسیم کیا اور سب لوگوں میں برابر برابر تقسیم کر دیا، حالانکہ ان لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں، جنہیں فضیلت، سبقت اور اولیت کا شرف حاصل ہے۔ بہتر ہوتا کہ آپ اہل سبقت، اولیت اور فضیلت کو ان کی فضیلت کے سبب دوسروں پر ترجیح دیتے۔" حضرت ابوبکرؓ نے معترضین کے اعتراض اور ان کے دلائل کو پوری توجہ سے سنا اور ان کے جواب میں فرمایا:

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، فصل کیف کان فرض عمر لاصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۵

[2] ایضاً

نما اعرفنی بذالک وانما ذلك شیئ ثوابه علی الله جل ثناؤہ، وھذا معاش فالاسوۃ فیه خیر من الاثرۃ [1]

"آپ لوگ جس سبقت، اولیت اور فضیلت کا ذکر کر رہے ہیں، میں اسے معاشی نقطۂ نظر سے کوئی) اہمیت نہیں دیتا۔ کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جل شانہٗ کے پاس ہے اور یہ (زیر بحث) مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ اس میں ترجیح کی بجائے برابری بہتر ہے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پورے عہدِ خلافت میں اسی برابری کی پالیسی پر عمل فرمایا۔ حالانکہ جیسا کہ آپ نے خود فرمایا اسلامی خدمات میں اولیت، فضیلت اور سبقت کی اہمیت کو ان سے زیادہ کون جانتا تھا۔ مگر اس بات کی وضاحت بھی صرف حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی ہی کر سکتی تھی کہ صحابہ کرام رض نے اسلام کی راہ میں جو خدمات انجام دی تھیں وہ صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے انجام دی تھیں۔ ان میں مادی فوائد اور مفادات کے حصول کا شائبہ تک نہ تھا:

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ [2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اسلام اور امّتِ مسلمہ کی خاطر خدمات انجام دینے سے جو کامیابی (فوزِ عظیم) حاصل ہوتی ہے وہ مادی فوائد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور صحابہ کرام رض نے اس فوزِ عظیم کی خاطر سب کچھ کیا تھا نہ کہ غنیمت کے مال سے زیادہ حصہ لینے کے لیے۔ آپ کا یہ نظام یقیناً اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم اور اللہ کے آخری رسول، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ قرآن حکیم کی تعلیمات ایثار کا سبق دیتی ہیں اور سنت رسول ان پر عمل کی راہ دکھاتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ [3]

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، فصل ... [illegible] ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ ... [illegible]

[2] ۵ : ۱۱۹ [3] قرآن حکیم۔ ۲ : ۲۱۹

" لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجئے ہر وہ چیز جو ضرورت سے زائد ہو۔"

قرآن نے مسلمانوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے :

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً [1]

"مسلمان وہ ہیں جو اپنے مال رات اور دن خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔"

مسلمانوں کی ایک صفت اس طرح بیان ہوئی ہے :

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ [2]

" وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود تنگی میں ہوں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے اسلامی خدمات "اوّلیت، فضیلت اور سبقت کو پیشِ نظر رکھنے کی بجائے معاشی نقطۂ نظر سے جو "الاثرۃ" یعنی ترجیح کی جگہ" الاسوۃ" یعنی برابری کا نظام وضع کیا۔ اس کی بنیاد قرآنِ حکیم کی یہی آیت " ویؤثرون" ہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا نظامِ تقسیم دولت کامیاب رہا اور اس دوران مسلمانوں میں جمع و احتکار اور ارتکازِ دولت نہیں ہوئی۔ بلکہ دولت مسلم معاشرہ میں مسلسل گردش کرتی رہی، معاشرہ بحیثیت مجموعی خوشحالی کی منازل طے کرتا رہا اور عوام کا معیارِ زندگی بڑھتا چلا گیا۔

جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد دوم کا عہد آیا، تو کچھ مدت تک تو آپ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نظامِ تقسیمِ دولت پر عمل پیرا رہے اور "تسویہ" یعنی برابری کی پالیسی پر گامزن رہے مگر فتح عراق کے موقع پر وہ اس پالیسی پر نظرِ ثانی کے متعلق سوچنے لگے :

لما قدم على عمر بن الخطاب رضي الله عنه جيش العراق من قبل سعد بن ابي وقاص رضي الله عنه قال له اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم

[illegible]

فی تدوین الدواوین وقد کان اتبع رأی ابی بکر فی التسویۃ بین الناس، فلما جاء فتح العراق شاور الناس فی التفضیل، ورأی ان لہ الرأی، فاشار علیہ بذلک من رآہ [1]

ابتدائے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کی لوگوں میں برابری والی پالیسی پر عمل کرتے رہے۔ جب فتح عراق کی خبر پہنچی تو آپ نے فضیلت والی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے لوگوں سے مشاورت کی اور خیال کیا کہ ان کی بھی اپنی رائے ہے اور جس نے بھی یہ رائے اختیار کی اس نے اظہار کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتوحات کا دائرہ مزید وسیع ہوا اور اموال و غنائم کثرت سے آئے۔ ان کثیر اموال و غنائم کی تقسیم کا وقت آیا تو آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی تقسیم دولت کی پالیسی پر غور کیا اور اس پر نظر ثانی کرنے کے متعلق سوچنے لگے۔ انہیں خیال پیدا ہوا۔

ان ابا بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رأی فی ھذا المال رأیا ولی فیہ رأی آخر لاجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ [2]

ابوبکر نے تقسیم دولت کے بارے میں ایک پالیسی اختیار کی تھی اور میری اس بارے میں دوسری پالیسی ہے۔ میں اس شخص کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لڑا ہو، اس شخص کے برابر قرار نہیں دے سکتا جس نے آپ کا ساتھ دیا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

واللہ الذی لا الہ الا ھو ما احد الا ولہ فی

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج فصل فی الفئی والخراج ص ۲۶

[2] ابو یوسف، کتاب الخراج، فصل کیف فرض عمر لاصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ص ۲۶

هذا المال حق اعطيه او امنعه وما احد احق به من احد الا عبد مملوك، وما انا فيه الا كاحدكم ولكنا على منازلنا من كتاب الله عز وجل و قسمنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم فالرجل وبلاؤه في الاسلام، والرجل وقدمه في الاسلام، والرجل وغناؤه في الاسلام والرجل وحاجته في الاسلام والله لئن بقيت لياتين الراعي بجبل صنعاء حظه من هذا المال وهو مكانه قبل ان يحمر وجهه يعني في طلبه [1]

اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایسا کوئی شخص نہیں جس کا اس مال میں حق نہ ہو۔ میں اسے اس کا حصہ دوں گا یا (بوجوہ) اس کا حصہ روک لیا جائے گا کوئی کسی سے زیادہ مستحق نہیں سوائے غلام کے، تقسیم مال میں میری حیثیت تم میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ البتہ کتاب اللہ کی رو سے ہماری درجہ بندی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم فرمائی ہے۔ ایک آدمی ہے جس کا اسلام میں مرتبہ ہے۔ ایک آدمی ہے جسے اسلام میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ایک آدمی ہے جسے اسلام میں غناء ہے۔ ایک آدمی ہے جسے اسلام سے حاجت ہے۔ بخدا اگر میں زندہ رہا تو صنعا کے پہاڑ میں گڈریے کو اس کے مال میں سے حصہ مل کر رہے گا۔ اس کا حصہ اس کے مکان پر ملے گا اور حصے کی طلب میں اس کا چہرہ سُرخ ہونے سے پہلے ملے گا۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے نظام تقسیم دولت سے اختلاف کرتے ہوئے "تسویہ" معاشی برابری کی بجائے اولیت فضیلت اور مقام و مرتبہ کی بنیاد پر تقسیم دولت کا نظام وضع کیا۔ اسی کے مطابق مہاجرین و

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج، فصل کیف کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفحہ ۵۰۔

انصارؓ اور دوسرے لوگوں کی درجہ بندی کی۔ وہ مہاجرین رضؓ اور انصار رضؓ جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ان کے لیے پانچ پانچ ہزار درہم مقرر ہوئے۔ جو حضرات فضیلت میں اصحاب بدر کے ہم پلّہ تھے مگر غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، ان کے لیے چار چار ہزار درہم مقرر کیے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لیے بارہ بارہ ہزار مقرر کیے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے لیے چار ہزار اور اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے لیے تین ہزار مقرر کیے۔ آپ کے بیٹے نے عرض کی: اے بابا آپ نے اسامہ کو مجھ سے ایک ہزار درہم زیادہ کیوں دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اس لیے کہ اسامہ کے والد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو آپ کے والد سے زیادہ محبوب تھے اور اسامہ آپ سے زیادہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو محبوب تھے۔ اسی طرح حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے پانچ پانچ ہزار درہم مقرر کیے۔ ان دونوں کو ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے ان کے والد کے برابر حصّہ دیا۔ اہلِ مکّہ اور دوسرے لوگوں کو صرف آٹھ آٹھ سو درہم دیئے گئے [1]

امام ابو یوسف کی ایک روایت کے مطابق جب اللہ تعالٰے نے ایران و روم کی فتح نصیب کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کا اجلاس طلب فرمایا اور اس کے سامنے مسلمانوں کے روزینے مقرر کرنے کے لیے سالانہ رقم مقرر کرنے کا مسئلہ پیش کیا۔

فقال اما ترون، فانی أری ان أجعل عطاء الناس فی کل سنة واجمع المال فانه اعظم للبرکة [2]

آپ نے استفسار کیا: آپ لوگوں کی کیا رائے ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ میں لوگوں کے لیے سالانہ روزینے مقرر کر دوں اور مال و دولت (بیت المال) میں جمع کر لوں۔ یہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت عظیم خیر و برکت کا موجب ہوگا۔ اصحابِ شوریٰ نے مسئلہ زیر بحث

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج فصل کیف فرض عمر ص ۴۶ [2] ابو یوسف کتاب الخراج ص ۴۷

پر پوری طرح سوچ بچار کی مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیا۔
بالآخر وہ سب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی حکمت کو پا گئے۔

قالوا: اصبح ما رأیت، فانك ان شاء الله موفق [1]

سب نے متفقہ طور پر کہا: جو آپ کی رائے ہے اس پر عمل فرمائیے۔
انشاء اللہ آپ کو توفیق حاصل ہوگی۔"

مجلس شوریٰ کے اس فیصلے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روزینے مقرر فرمائے۔ ان کی شرح اور ادائیگی کا حساب کتاب رکھنے کے لیے دیوان کی تیاری کا حکم صادر فرمایا جس کے لیے لوح (رجسٹر) طلب فرمایا: "فدعا باللوح" اب مسئلہ یہ پیش آیا کہ اس دیوان کی ابتدا کس سے کی جائے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے رائے دی" ابدأ بنفسك" آپ اپنے نام سے ابتدا کیجئے۔ آپ نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا بلکہ خود ہی فرمایا:" ولكن ابدأ بني هاشم رهط النبي صلى الله عليه وسلم" بلکہ میں بنی ہاشم سے ابتدا کرتا ہوں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ ہے" ثم الاقرب فالاقرب الى بنى هاشم۔ پھر بنی ہاشم سے قریب سے قریب تر کی بنیاد پر دیوان مکمل ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تقسیم دولت کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی طے پایا تھا کہ ہر پیدا ہونے والے بچے کو ایک سو درہم دیئے جائیں۔ جب بچہ ذرا بڑا ہو جاتا تھا تو دو سو درہم اور جب وہ بالغ ہو جاتا تھا تو اور بڑھا دیئے جاتے تھے۔

وكان للنفوس اذا طرحته امه مائة درهم، فاذا ترعرع بلغ به مائتين، فاذا بلغ زاده [2]

آج ایسی مختلف پالیسیوں اور سکیموں پر مغربی اور مشرقی ممالک عمل پیرا ہیں، جن کے تحت ملک کے تمام شہریوں کے روزگار کی ذمے داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر حکومت کسی شہری کو روزگار فراہم نہ کر سکے تو اسے روزینہ

---

[1] ابویوسف، کتاب الخراج۔ ص ۴۷۔
[2] " " " ۵۴۔

دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسی طرح بچوں، بوڑھوں، اپاہجوں، محتاجوں، معذوروں، بیواؤں وغیرہ کی مالی اعانت اور فلاح وبہبود کے لیے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ حالانکہ جیسے اوپر بیان ہوا یہ سب طریقے ابتدائے اسلام کے انتہائی ترقی یافتہ اور منتظم نظام کی ایک جھلک ہیں مگر حیرت ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان اسلام کے اس نظام تقسیم دولت سے بے خبر ہیں اور آج جب وہ عہد حاضر کے ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کی سکیموں کا ذکر سنتے ہیں تو حیرت و استعجاب سے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ شاید یہ عہد حاضر ہی کی ایجاد ہیں۔ اور یہ کہ شاید تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے مگر جیسا کہ اوپر بیان ہوا اوروں پر کیا شکوہ خود مسلمان اپنے دین، اس کی بنیادی تعلیمات اور اپنی تاریخ سے اس حد تک بے خبر ہیں کہ جب ابتدائے اسلام کی یہ باتیں انہیں بتائی جاتی ہیں تو وہ اس قدر حیران ہوتے ہیں کہ انہیں ان کی صحت پر یقین نہیں آتا۔ اور وہ بڑی مشکل سے انہیں ماننے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہمارے چاروں طرف معاشرہ ان تعلیمات کے خلاف ہے اور جن لوگوں سے مسلمانوں کو توقع ہے کہ وہ انہیں صحیح دین اسلام بتائیں گے وہ توقع پر پورے نہیں اتر رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ مدت تک اپنی وضع کردہ فضیلت پر مبنی تقسیم دولت کی پالیسی پر عمل فرمایا۔ اس دوران اس پالیسی کے اثرات و نتائج معاشرت پر مرتب ہونے شروع ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک بیدار مغز حکمران، وسیع القلب مدبر، وسیع النظر مفکر اور کتاب وسنّت کی تعلیمات پر ہمیشہ غور و فکر کرتے رہنے والے مردِ مومن کی طرح خود ہی اپنی تقسیم دولت کی پالیسی کے اثرات کا جائزہ لیا اور اس کے نتائج پر گہرے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ تقسیم دولت کی اس پالیسی کے سبب ارتکاز دولت ہونے لگی ہے اور دولت معاشرے میں گردش کرنے کی بجائے چند ہاتھوں میں سمٹنے لگی ہے: "ان المال قد کثر" جب دیکھا کہ دولت کی کثرت ہونے لگی ہے اور اس کے مطابق معاشرے میں تبدیلیاں واقع

ہونے لگی ہیں تو آپ نے ارتکاز دولت کے محرکات وعوامل اور اس کے اسباب وعلل پر توجہ دی۔ بالآخر آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا وضع کردہ نظام تقسیم دولت نظر ثانی کا محتاج ہے۔ چنانچہ آپ نے اس پر نظر ثانی کا پختہ فیصلہ کر لیا اور اپنے اس فیصلے کا اعلان بھی فرما دیا:

قال: لئن عشت الی ھذہ اللیلۃ من قابل لالحقن آخری الناس باولاھم حتیٰ یکونوا فی العطاء سواءً[1]

آپ نے فرمایا: "اگر میں آئندہ مالی سال کے آغاز کی رات تک زندہ رہا تو بالضرور آخرین کو اوّلین کے ساتھ ملا دوں گا تاکہ وہ عطایا میں برابر برابر ہو جائیں۔"

راوی کہتا ہے کہ آئندہ سال آنے سے قبل ہی آپ شہید کر دیئے گئے۔ اللہ آپ پر اپنی رحمت فرمائے۔

فتوفی رحمہ اللہ قبل ذالک[2]

ظاہر ہے کہ اگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آئندہ مالی سال کے آغاز تک زندہ رہتے تو آپ اپنے اعلان کے مطابق اپنے وضع کردہ نظام تقسیم دولت پر ضرور نظر ثانی فرماتے، اوّلیت اور فضیلت کی بنیاد پر معاشی نقطۂ نظر سے ترجیح کے بجائے برابری کے اصول پر عمل پیرا ہوتے۔ آپ نے اپنے اعلان میں جو فرمایا کہ "میں آخرین کو اوّلین کے ساتھ ملا دوں گا" تو اس سے یہی مراد تھی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے میں اولیت کی فضیلت حاصل ہے اور جن کو دولت اسلام بعد میں حاصل ہوئی ان میں معاشی نقطۂ نظر سے تفاوت نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ روزی کے معاملے میں برابری کے مستحق ہیں۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرما دیا کہ آئندہ مالی سال سے وہ اس تفاوت کو ختم کر دیں گے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح سب کو برابر برابر دیں گے۔

---

[1] ابو یوسف۔ کتاب الخراج۔ صـ۲۵

[2] ایضاً

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے نظام تقسیم دولت کی حکمت کو اپنے عملی تجربے سے پہچان لیا تھا۔ اور اس کی بہتری کے قائل ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نظام کو دوبارہ اپنانے کے فیصلے کا اعلان بھی فرما دیا تھا۔ مگر آپؓ شہید کر دیئے گئے اور شہادت نے آپؓ کو نظام میں تبدیلی لانے کی مہلت نہ دی۔ آپؓ کی شہادت کے محرکات کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

عہدِ خلافتِ راشدہ میں تقسیم دولت کا نظام قائم کرنے میں ان فتوحات کو بڑا دخل تھا جو عراق، ایران، شام، مصر، شمالی افریقہ اور وسط ایشیا میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں اور ان فتوحات کے نتیجے میں مفتوحہ ممالک کی زرعی اراضی مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ اسلام نے اس تقسیم میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ تبدیلیاں یہ تھیں۔ تمام مسلمان مجاہدین کو بلا امتیاز رتبہ برابر برابر حصہ ملتا تھا۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ایک مسلمان زیادہ شجاع اور بہادر ہے وہ اسلحہ سے بھی زیادہ لیس ہے تو اس کو زیادہ حصہ ملے۔ اور ایک مسلمان کمزور ہے اور اس کے پاس تلوار کے سوا اسلحہ بھی نہیں تو اسے کم ملے، اس طرح یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ ایک مسلمان مجاہد کا گھوڑا طاقت ور قوی اور توانا ہے اور دوسرے کا کمزور اور ناتواں، تو طاقتور گھوڑے والے کو زیادہ حصہ ملے اور کمزور والے کو تھوڑا۔ بلکہ سب کا حصہ برابر ہوتا تھا۔

ولا یفضل الخیل بعضها علی بعض ... ولا یفضل الفرس القوی علی الفرس الضعیف، ولا یفضل الرجل الشجاع التام السلاح علی الرجل الجبان الذی لا سلاح معه الا سیفه [1]

یہ تفصیل بتاتی ہے کہ اسلامی فوج بلا امتیاز رتبہ سب اسلام کے سپاہی تھے۔ ان کی جان نثاری، شجاعت، بہادری صرف اور صرف اسلام کے لیے وقف تھی۔

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج۔ ص ۱۹ باب فی قسمة الغنائم۔

انہیں مقام و رتبہ صرف مزید خدمات بجالانے کے لیے ملتا تھا۔ اس میں مادی محرکات و عوامل شامل نہ ہوتے تھے۔ نہ تنخواہ بڑھتی تھی نہ مالِ غنیمت میں زیادہ حصّہ ملتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی فوج تسویہ اور برابری کی بنیاد پر قائم تھی۔ نہ مربعے الاٹ ہوتے تھے نہ جاگیریں ملتی تھیں اور نہ مادی فوائد ان کی بے لوث خدمات کے محرکات تھے۔

عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ میں صحابہ کرام نے شجاعت و بہادری کے جو عظیم الشان اور محیر العقول کارنامے انجام دیئے وہ سب مادی محرکات سے بالا اور بے نیاز ہو کر دیئے۔ ان مبارک عہدوں میں نظام تقسیم دولت کے تحت تمام مسلمانوں کی عزّتِ نفس محفوظ تھی۔ انہیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اظہار کے وافر مواقع فراہم تھے۔ وہ جس فن کو اپناتے تھے، اس میں کمال کر دکھاتے تھے۔ انہیں حادثات میں گرفتار ہو کر پریشان ہونے کی فکر دامن گیر نہ ہوتی تھی۔ وہ بے خوفی اور بے باکی سے مہم جوئی کو دعوت دیتے تھے۔ اسلام کی خاطر جان نثاری اور فدا کاری ان کا معمول تھا۔

خلافت کا نظام تقسیم دولت انہیں بیوی بچوں کی کفالت سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ وہ ماں باپ کے بڑھاپے اور بہن بھائیوں کے مسائل سے بے فکر ہوتے تھے اس لیے کہ حکومت تمام شہریوں کی کفالت کی ذمّے دار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شہری پوری بے جگری، دلجمعی، لگن اور مشن سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ ملک و معاشرہ اور فضا و ماحول اسے تخلیقی کارنامے انجام دینے پر اُکساتے تھے۔ تقسیم دولت کے اس نظام کی بدولت مسلمانوں کے اندر قوّتِ کار کا بے پناہ اضافہ ہوا اور اس قوّتِ کار کے محرکات خالصتہً دینی اسلامی اور روحانی تھے، مادّی اور ذاتی ہرگز نہ تھے۔ دوسرے نظاموں پر اسلام کو یہی فضیلت حاصل ہے کہ اس میں غیر مادّی عوامل انسان کو بے پناہ قوّتِ کار عطا کرتے ہیں۔ اور اس کی کارکردگی میں مادّی عوامل کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ غیر اسلامی نظام والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مادّی محرکات کے علاوہ بھی کوئی جذبہ محرکہ ایسا ہے جو انسان کو قوّتِ کار عطا کر سکتا ہے اور اسے انسانیت کی مجموعی فلاح و بہبود

کے لیے کام پر اُبھار سکتا ہے۔ حالانکہ اگر قرآن و سنّت کی تعلیمات کا ٹھنڈے دل و دماغ، غیر جانبدارانہ انداز، غیر متعصبانہ طریق اور محققانہ طرز پر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھُل کر سامنے آ جائے گی کہ اسلام خالصتہً غیر مادی عوامل اور کلیتہً دینی محرکات سے انسان میں یہ قوّت کار پیدا کرتا رہا ہے اور جب بھی اسے دل و دماغ کی کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنایا گیا وہ یہی نتائج پھر پیدا کر سکتا ہے۔

اسلامی فتوحات کے نتیجے میں جو زرعی اراضی مسلمانوں کو حاصل ہوئی اس کی تقسیم بھی اسی اصول پر ہوئی۔ جزیرہ عرب کے باہر عراق، ایران، شام، مصر، شمالی افریقہ اور وسط ایشیا کی فتوحات و اراضیات پر تاریخ اسلام کی متداول کتب کے علاوہ فتوح البلدان، فتوح الشام، مغازی سیرت و دیگر فنون کی کتب تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں۔ اراضیات کی تقسیم کا مسئلہ امام ابو یوسف، امام ابو عبید، امام یحییٰ بن آدم وغیرہ ائمہ نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ جب عراق و شام کی زمینیں فتح ہوئیں تو بعض مسلمانوں نے انہیں غنیمت کے مال کی طرح تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

وقد سأل بلال و اصحابه عمر بن الخطاب رضی الله عنه قسمة ما افاء الله عليهم من العراق و الشام و قالوا اقسم الارضين بين الذين افتتحوها كما تقسم غنيمة العسكر [1]

حضرت بلال رض اور ان کے حامیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عراق و شام کی مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا، کہا، ان زمینوں کو ان کے فاتحین میں اسی طرح تقسیم کریں جس طرح فوجی غنیمت تقسیم ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ "فابی عمر ذلك عليهم" اور کہا۔

فلو قسمته لم يبق لمن بعدكم شئ [2]

اگر میں نے انہیں تقسیم کر دیا تو تمہارے بعد آنے والوں کے لیے کچھ نہ بچے گا۔

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج - ص ۲۵۔ [2] ابو یوسف، کتاب الخراج - ص ۲۵۔

جو لوگ مفتوحہ زمینوں کی تقسیم چاہتے تھے ان کے دلائل یہ تھے کہ جن مجاہدین کی تلواروں نے یہ زمینیں فتح کی ہیں یہ انہیں کا حق ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان دلائل سے قائل نہیں ہوتے تھے وہ فرماتے تھے :

فكيف بمن يأتي من المسلمين فيجدون الارض بعلوجها وقد اقتسمت وورثت عن الآباء وحيزت ما هٰذا برأي ۔ [1]

یہ تقسیم کیسے ممکن ہے ؟ جب آئندہ نسل کے مسلمان آئیں گے اور پائیں گے کہ زمینیں کسانوں سمیت تقسیم ہو چکی ہیں اور آباء سے اولاد میں وراثتہً منتقل ہو کر بٹ بھی چکی ہیں۔ یہ تو عجیب و غریب رائے ہے۔

عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے فرمایا :

فما الرأي ؟ ما الأرض والعلوج الا مما افاء الله عليهم [2]

تو یہ کیا رائے ہے ؟ زمین اور کسان تو انہیں کے ہیں جن کے ہاتھوں اللہ نے انہیں فتح دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ آپ کی بات درست ہے مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ اگر میں عراق اور شام کی زمینیں کسانوں سمیت تقسیم کر دوں تو سرحدوں کی حفاظت کیسے ہو گی ؟ اور اس ملک و دیگر ممالک شام و عراق کے بچوں اور بیواؤں کا کیا بنے گا ؟

مخالفین کا جواب یہ تھا کہ آپ چاہتے ہیں کہ وہ زمینیں جنہیں ہماری تلواروں نے فتح کیا انہیں آپ ان لوگوں کے لیے وقف کر رکھیں جو نہ اس وقت موجود ہیں اور نہ ہی جنگ میں شریک ہوئے ہیں پھر آپ ان لوگوں کی اولاد کو دیں پھر ان کی اولاد کی اولاد کو دیں جو موجود ہی نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہی فرماتے جاتے "هٰذا رأيي" ، یہ میری رائے ہے۔ مخالفین نے کہا اس پر شوریٰ کا اجلاس بلایا جائے اور اس مسئلے پر کھل کر بحث ہو۔ چنانچہ مدینہ کی شوریٰ کا اجلاس بلایا گیا جس میں زمینوں کو ذاتی ملکیت میں دینے یا حکومت کی تحویل میں بطور امانت امت مسلمہ کے لیے

---

[1] ابو یوسف، کتاب الخراج۔ ص ۲۴۔ [2] ابو یوسف کتاب الخراج۔ ص ۲۶۔

رکھنے کے مسئلے پر بحث ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمینوں کو تقسیم کر کے ذاتی ملکیت میں دینے کے مخالف تھے۔ شوریٰ میں جو صحابہؓ کرام آپ کے موقف کے حامی تھے ان میں منجملہ دیگر اصحاب کے چند مشہور نام یہ تھے: حضرت عثمانؓ بن عفان، حضرت علیؓ بن ابی طالب حضرت طلحہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ۔ آپ کے مخالفین میں سرِ فہرست حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت بلالؓ تھے۔ انصار کے دونوں بڑے قبیلوں اوس اور خزرج کے پانچ پانچ اشراف و کبار بطور خاص بلائے گئے اور بحث کا آغاز ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجلاس کے شروع ہی میں اپنے متعلق خاص طور پر فرمایا: "فانی واحد کاحدکم" میری حیثیت تم میں سے ایک فرد کی ہے[1] آج تم لوگ حق کو قائم کرنے والے ہو۔ جس نے میری مخالفت کی، مخالفت کی۔ اور جس نے میری موافقت کی، موافقت کی۔ اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ تم میری خواہش کی پیروی کرو۔" ولست ارید ان تتبعوا ھذا الذی ھوای" تمہارے پاس اللہ کی کتاب ناطق بالحق ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا: تم ان لوگوں کے بیانات سُن چکے ہو جو گمان کرتے ہیں کہ میں نے زمینیں ان کی ذاتی ملکیت میں نہ دے کر ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ حالانکہ میں ظلم پر سوار ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر کوئی چیز ان کی تھی میں نے انہیں نہیں دی ان کے علاوہ کسی اور کو دے دی ہے تو واقعی میں نے ظلم کیا ہے۔ قال: قد سمعتم کلام ھؤلاء القوم

---

[1] اس سے شوریٰ میں خلیفۃ المسلمین، امیر المؤمنین کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شوریٰ کا کام محض مشورہ دینا نہیں۔ شوریٰ میں خلیفۃ المسلمین کی رائے ایک فرد کی رائے ہے۔ البتہ یہ امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ ایسے شخص کو سربراہ بنائے جو فہم و فراست، عقل و دانش، اجتہاد و استنباط کی صفات سے پوری طرح مزین ہو۔ اور اپنی اعلیٰ قابلیت، لیاقت اور اہلیت سے شوریٰ کو اپنی رائے سے قائل کرے سب کے اتفاق رائے سے قانون بنائے۔

الذين زعموا الی اظلمهم حقوقهم و إنی اعوذ بالله ان ارکب ظلما۔ لئن کنت ظلمتهم شیئا هو لهم و اعطیته غیرهم لقد شقیت ۔ [1] بلکہ میری رائے یہ ہے کہ کسریٰ کی زمینیں فتح ہوچکی ہیں۔ اللہ نے ہمیں ان کے اموال اور اراضی اور کسان فتح میں دیئے ہیں۔ میں اموال ان میں تقسیم کرچکا ہوں اور خمس نکال چکا ہوں۔ میرا موقف یہ ہے کہ زمینیں کسانوں سمیت بحق سرکار حکومت کی تحویل میں روک لوں اور ان پر خراج لگادوں اور زمینوں پر جزیہ مقرر کردوں جسے وہ حکومت کو ادا کردیں۔

وقد رأیت ان احبس الارضین بعلوجها و اضع علیهم فیها الخراج، و فی رقابهم الجزیه یؤدونها ـــــ

یہ سب مسلمانوں کی مشترکہ ملکیت قرار پائے ـــ فتکون فیئا للمسلمین المقاتلة ولمن یاتی من بعدهم ۔ [2]

مسلمانوں کی اس مشترکہ ملکیت میں مجاہدین، بچے اور ان کی آئندہ نسلیں شریک ہوں۔ آپ یہ سرحدیں دیکھ رہے ہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے فوج درکار ہے۔ آپ یہ عظیم الشان ممالک شام، جزیرہ، کوفہ، البصرہ، مصر دیکھ رہے ہیں جن میں لشکروں کی ضرورت ہے۔ جن پر اخراجات ہوں گے۔ یہ سب کہاں سے آئیں گے۔ اگر زمینیں اور کسان تقسیم کردیئے جائیں ارأیتم هذه الثغور لا بد لها من رجال یلزمونها، ارأیتم هذه المدن العظام کالشام والجزیرة و الکوفة و البصرة و مصر ۔ لا بد لها من ان تشحن بالجیوش، و ادرار العطاء علیهم فمن این یعطی هؤلاء اذا قسمت الارضون و العلوج [3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر نہایت پُرمغز، مؤثر اور مدلل تھی۔ آپ کے

---

[1] ابو یوسف۔ کتاب الخراج ص۲۷۔

[2] ایضاً

[3] ایضاً

دلائل انتہائی وزنی۔ آپ کی باتیں مسکت اور لاجواب تھیں۔ آپ نے اپنے موقف کی تائید میں سورۂ حشر کی سات سے دس تک آیات تلاوت فرمائیں۔ جن میں مفتوحہ زمینوں کی تقسیم اور ان سے استفادے کی تعلیم دی گئی ہے۔

- مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى۔
فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ۔
- وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ
- لِلْفُقَرَاءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ
- وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔
- وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ۔

ان آیات میں تقسیم دولت کا بنیادی اصول یہ فرمایا ہے کہ دولت معاشرے میں مسلسل گردش کرتی رہے اور وہ صرف سرمایہ داروں کے درمیان ہی سمٹ کر نہ رہ جائے۔ زمینوں کی تقسیم پانچ اقسام پر مشتمل بتائی۔

۱۔ اللہ اور رسول۔
۲۔ اقرباء، یتامیٰ۔ مساکین اور مسافر۔
۳۔ مہاجرین۔
۴۔ انصار۔
۵۔ آئندہ آنے والے مسلمان۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ تھا کہ جب خود قرآن حکیم نے مفتوحہ زمینوں کی آمدنی میں آئندہ آنے والے مسلمانوں کو شریک کیا ہے اور انہیں ان زمینوں سے مستفید ہونے کا اسی طرح مستحق ٹھہرایا ہے جس طرح مہاجرین اور انصار مستحق ہیں۔ تو پھر کس طرح موجودہ مسلمانوں میں یہ زمینیں تقسیم کر دی جائیں اور آئندہ اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں کو ان سے محروم کر دیا جائے۔ ایسی تقسیم قرآن حکیم کی تقسیم کے خلاف ہوگی۔ اس لیے مفتوحہ زمینوں کی تقسیم از روئے قرآن اسی صورت میں درست ـــــ قرار پائے گی جبکہ انہیں فاتحین میں تقسیم کرنے کی بجائے حکومت کی تحویل میں رہنے دیا جائے تاکہ موجودہ اور آئندہ مسلمان ان کی مجموعی

آمدنی سے مستفید ہوتے رہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم فرمائی تو مخالف و موافق سب پکار اُٹھے" الرأی رأیک" رائے آپ ہی کی رائے ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا اور آپ نے جو کچھ سوچا بالکل درست ہے۔" فنعم ما قلت وما رأیت" اگر ان سرحدوں کی حفاظت نہ ہوئی۔ ان شہروں کی نگرانی نہ کی گئی تو کفار پھر ان شہروں کی طرف لوٹ کر ان پر قابض ہو جائیں گے۔ مجلس شوریٰ نے جب متفقہ طور پر آپ کے موقف کی تائید کر دی تو آپ نے فرمایا اب بات بالکل کھل کر واضح ہو گئی ہے۔" قد بان لی الامر"۔ [1]

اس سے ظاہر ہے کہ جب تک شوریٰ کا اتفاق رائے نہیں ہوا اس وقت تک حضرت عمرؓ اپنی رائے کو ذاتی رائے قرار دیتے رہے۔ آپ نے کسی موقع پر حقِ استرداد استعمال نہیں کیا۔ آپ نے اپنی قابلیت اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں سے اتفاق رائے سے قانون بنایا۔ قائد اور سربراہ وہی بننے کا حق رکھتا ہے جو دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ اسلام اسے قائد و سربراہ تسلیم نہیں کرتا جو عقل و فہم سے تو عاری ہو مگر ظلم و استبداد سے مسلمانوں پر تسلط جمائے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کا متفقہ فیصلہ اور صحابہ کرام رضؓ کا اجماع قانونی شکل اختیار کر گیا۔

حضرت عمرؓ نے مجلس شوریٰ کا وضع کردہ یہ قانون فاتح سواد و عراق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا تاکہ وہ اسے نافذ کریں۔ حضرت سعد رضؓ نے اس پر عمل کرتے ہوئے زمینیں حکومت کی ملکیت قرار دے دیں۔ حضرت عمرؓ نے ماہر اراضیات حضرت عثمان بن حنیف کو عراق بھیجا کہ وہ زمین کی مساحت کے فرائض انجام دیں جس کے مطابق خراج مقرر ہوا۔ اس اجماعی فیصلے کی روشنی میں تمام ممالک اسلامیہ کی اراضی حکومت کی ملکیت قرار پائیں۔ ان کی مجموعی آمدنی سے مسلمانوں کو مقررہ شرح سے روزینے دیئے جاتے تھے بقیہ آمدنی اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت اور مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود اور امّتِ مسلمہ کی ترقی و عروج

---

[1] ابو یوسف۔ کتاب الخراج ص ۲۴

پر خرچ ہوتی رہی۔

جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو حکمرانوں نے اسلام کی تعلیمات کے خلاف ممالک اسلامیہ کی زمینوں میں تصرف کرنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں امّتِ مسلمہ کی مشترکہ ملکیت سے نکال کر ذاتی اغراض و خواہشات اور شخصی مفادات و مقاصد کے لیے استعمال میں لانے لگے۔ حکمرانوں کی غلط بخششوں کے سبب امّت مسلمہ کی مشترکہ امانت (فیئ للمسلمین) میں خیانت ہونے لگی۔ امت کی کثیر آبادی کو زمینوں کی ملکیت سے محروم کر کے ایک محدود جاگیردار طبقہ پیدا کیا گیا۔ سامراجی (یورپی) حکمرانوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے زمینوں کو جاگیروں کی شکل میں دے کر امّت مسلمہ کی مشترکہ امانت میں خیانت کی حد کر دی۔

اسلامی حکومت کا اوّلین فرض ہے کہ وہ اسلام کے نظام تقسیم دولت کو اپنائے۔ زر اور زمین کا اسلامی تعلیمات کے مطابق نظام قائم کرے۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے جو نظام تقسیم دولت اپنایا تھا وہ کتاب و سنّت کے عین مطابق تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عملی تجربے سے اسی نظام کی صداقت، حقیقت اور حکمت کو پہچان لیا تھا اور اسے اپنانے کا اعلان فرمایا تھا۔ امّتِ مسلمہ منتظر ہے کہ کوئی مسلمان حکومت حضرت فاروق اعظمؓ کے اعلان کے مطابق اسلام کا نظام تقسیم دولت دوبارہ نافذ کرے۔ اس وقت افراط و تفریط پر مبنی دو معاشی نظام — سرمایہ دارانہ اور اشتراکیت — دنیا میں رائج ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام ذاتی اور شخصی مقاصد پر مبنی ہے۔ اس نظام میں زمین، صنعت اور تجارت میں محنت کا جذبہ محرکہ ذاتی مفادات ہیں۔ اشتراکی نظام میں محنت کا یہ جذبہ محرکہ نہیں۔ اس نظام کے حامی دعوے کرتے ہیں کہ ذرائع و وسائل دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہوتے۔ اسلام کے نظام تقسیم دولت میں محنت کا جذبہ محرکہ بھی وافر مقدار میں موجود ہے اور ذرائع و وسائل دولت بھی چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہوتے۔ بلکہ دولت مسلسل گردش کرتی رہتی ہے۔ گویا یہ نظام محنت کے لامتناہی جذبہ محرکہ اور ذرائع و وسائل دولت کے مسلسل گردش کرتے رہنے کا دوسرا نام ہے۔ جس سے انسان کے معیار زندگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور معاشرہ مسلسل عروج و ارتقاء کی منازل طے کرتا جاتا ہے۔

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. 2 | NOVEMBER 1983 | No. 9

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ